دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

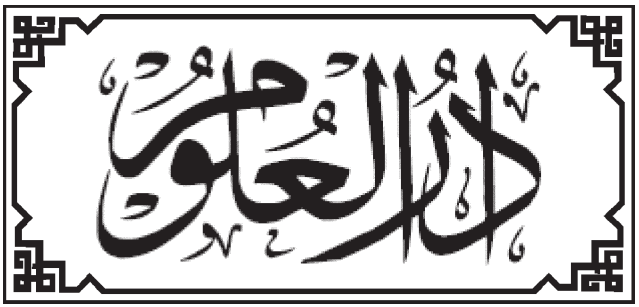

جلد: ۹۷	رمضان-شوال ۱۴۳۴ھ مطابق جولائی-اگست ۲۰۱۳ء	شمارہ: ۷-۸

نگراں	مدیر
حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند-۲۴۷۵۵۴ یوپی

ہندوستان سے فی شمارہ-/۱۵ روپے، سالانہ-/۱۵۰ روپے
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ-/۱۱۰۰ روپے
بنگلہ دیش سے سالانہ-/۵۰۰ روپے، پاکستان سے ہندوستانی رقم-/۵۰۰ روپے

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

R. N. I. No. 2133/57

DARUL ULOOM Monthly (Urdu) Printed, Published by Maulana Marghubur Rahman,
Owned by Darul Uloom Grush. Published From Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at Darul Uloom Printing Press Deoband, Saharanpur
Editor : Maulana Habibur Rahman Azmi

فہرست مضامین

نمبر شمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرفِ آغاز	حبیب الرحمٰن اعظمی	۳
۲	کُفّار سے مشابہت اختیار کرنے کا شرعی حکم	محمد راشد ڈسکوی	۶
۳	حلال کی برکت اور حرام کی نحوست	مولانا برید احمد نعمانی	۲۲
۴	رشوت پر وعید اور اس کا شرعی حکم	مولانا غفران ساجد قاسمی	۲۷
۵	نماز تراویح	مولانا نجیب قاسمی سنبھلی	۳۴
۶	مسائلِ کلامیہ کے باب میں مصنّفاتِ امام نانوتویؒ....	فخر الاسلام مظاہری علیگ	۴۹
۷	صدیق اکبرؓ کا قول ''امْصَصْ بَظْرَ اللات''...	مولانا عمر فاروق لوہاروی	۶۰
۸	تفسیر اور اصولِ تفسیر کی تدریس	مولانا اشتیاق احمد قاسمی	۶۷
۹	مہر اور جہیز کی بے اعتدالیاں	مولانا محمد انعام الحق قاسمی	۸۲
۱۰	فرقۂ اباضیہ اپنے عقائد وافکار کے آئینے میں	مولانا اشرف عباس قاسمی	۸۹
۱۱	بے پردگی کے نقصانات	مولانا شفیق احمد قاسمی، ریاض	۹۶
۱۲	ویکسین! ایک غور طلب پہلو	ڈاکٹر مبشر حسین رحمانی	۱۰۱
۱۳	دہلی اور اقوام متحدہ کا فروغ ''زنا'' قانون	ڈاکٹر ایم اجمل فاروقی	۱۰۵
۱۴	ایک ''محدث گر'' کی رحلت	مولانا محمد صاحب پرتاب گڑھی	۱۰۸

ختم خریداری کی اطلاع

یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات جناب مولانا شیر محمد صاحب ناظم جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ، لاہور کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن اعظمی

''شعبان المعظم'' کا مہینہ ہمارے لیے اگر اس حیثیت سے اہمیت کا حامل ہے کہ یہ رمضان المبارک کی آمد کا مُنادی ہے اور ہر مرد مسلم کو دعوت دیتا ہے کہ ماہ رمضان (جو گلستانِ اسلام کا موسم بہار ہے) کے استقبال کے لیے اپنے آپ کو اچھی طرح تیار کرلو۔

وہیں یہ مہینہ اس اعتبار سے بھی علمی و دینی معاشرہ کے لیے باعثِ اہمیت ہے کہ اسلامی دانش گاہوں کا تعلیمی سال اسی ماہِ عظیم میں اختتام پزیر ہوتا ہے۔ ہماری ان دینی تعلیم گاہوں کا تعلیمی وتربیتی آغاز ''شوال'' میں ہوتا ہے۔ اس وقت ہزاروں کی تعداد میں طالبانِ علوم نبوت دینی مدارس میں داخل ہوتے ہیں اور ان کے چشمۂ فیض سے اپنے اپنے ظرف وحوصلہ کے مطابق علم وآگہی اور فکر وفن کے آبِ حیات سے سیراب ہوتے ہیں، ان طلبۂ علوم میں بہت سے وہ ہوتے ہیں جن کا تعلیمی سفر تعلیمی سال کے اس اختتامی مہینہ میں تکمیل کی منزل سے ہم کنار ہوجاتا ہے، جہاں سے ان کی زندگی کا ایک نیا سفر شروع ہوتا ہے۔

اس موقع پر ہمارے ان ہونہار نوجوانوں کو خوب اچھی طرح یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ ہماری تمام تر علمی و دینی کاوشوں اور محنت و ریاضت کا بارگاہ رب العزت میں شرف قبولیت سے بہرہ ور ہونا، ہمارے حسنِ عمل اور اخلاصِ نیت پر موقوف ہے۔ اگر آپ اپنے اندر اخلاص وللّٰہیت کی صفت پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں تو پھر یقین کرلیجیے کہ کامیابی وکامرانی کی کنجی آپ کے ہاتھ میں آگئی ہے، اور گوہرِ مقصود آپ کے قبضہ میں ہے۔

اور اگر ہمارا دل اخلاص سے عاری اور للّٰہیت سے ناآشنا ہے، تو تمام تر علمی لیاقت وصلاحیت

کے باوجود ہم اپنے آپ کو نامرادی کے اس اندیشہ سے بہرحال محفوظ نہیں رکھ پائیں گے کہ

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اَعرابی
کیں راہ تو می روی بہ ترکستان است

تحصیل علوم دین کا مقصدِ واحد رضائے الٰہی ہونی چاہیے "مَنْ خَرَجَ فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" کی بشارت کا استحقاق اسی وقت ہوگا جبکہ تعلیم وتحصیل کا مقصود خوشنودیِ ربِ کائنات ہو، اسی بناء پر امام بخاری رحمہ اللہ نے "الجامع الصحیح" میں سب سے پہلے حدیث پاک "اِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَاتِ" کو لاکر واضح اشاروں میں یہ بتادیا کہ تحصیلِ علوم کے میدان میں قدم رکھنے سے پہلے نیت کا جائزہ لے لینا ضروری ہے۔

آپ اس وقت اپنے تعلیمی سفر کی تکمیل کے بعد جہد وعمل، کے میدان میں قدم رکھنے کے لیے پرتول رہے ہیں تو اس اگلے سفر کو شروع کرنے سے پہلے خانۂ دل کو اخلاص وللّٰہیت سے معمور کرلیجیے، اور بغیر کسی خوف واندیشہ کے تعمیر وترقی کے میدان میں اتر جایئے کیوں کہ اخلاص کی مضبوط ومستحکم بنیاد پر جو عمارت بھی قائم کیجائے گی وہ انشاء اللہ استوار وپائیدار ہوگی، بہ صورت دیگر یہی علوم ومعارف جو دونوں جہان کی صلاح وفلاح کا ضامن ہیں، ابدی حرمان وخسران کا سبب بن جاتے ہیں؛ چنانچہ نبیِ صادق ومصدوق علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے "مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِيُجَارِيَ بِهِ الْعُلَمَاءَ، اَوْ لِيُمَارِيَ بِهِ السُّفَهَاءَ، أَوْ يُصْرِفَ بِهِ وُجُوْهَ النَّاسِ إِلَيْهِ أَدْخَلَهُ اللّٰهُ النَّارَ" جس نے علم دین اس غرض سے حاصل کیا؛ تاکہ اس کے ذریعہ علماء سے مقابلہ کرے گا، یا تاکہ اس کے ذریعہ احمقوں سے حجت بازی کرے گا، یا لوگوں کو اپنی جانب مائل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے نارِ جہنم میں داخل کریں گے۔

میرے عزیزو! زندگی کے یہ لمحات بڑے اہم ہیں آپ کو اس وقت اچھی طرح اپنے دل کو ٹٹول لینا چاہیے، اگر اخلاصِ نیت کی جانب سے ذرا بھی بے اطمینانی ہو تو پہلے اس کی فکر کیجیے، اِسے قطعی طور سے مت بھولیے کہ اخلاصِ نیت اور جذبۂ قربانی کے بغیر صحیح طور پر دین واسلام کی خدمت انجام نہیں دی جاسکتی، اسلام کی پوری تاریخ اس بات کی شاہدِ عدل، اور سچی گواہ ہے کہ اسلام کی صحیح معنوں میں خدمت انجام دینے والے، اور اسلام ومسلمانوں پر جب بھی کوئی افتاد پڑی ہے، تو اس کی حفاظت وپاسبانی کا فریضہ انجام دینے والے خدا کے مخلصین بندے ہی تھے، اخلاص وایثار کے انہی پیکروں نے ہمیشہ ملت کی کشتی کو طوفانوں سے بچا کر امن وسلامتی کے

ساحل تک پہنچایا ہے، اپنے اسلاف واکابر کے تراجم اور حالاتِ زندگی کا مطالعہ کیجیے، آپ کو صاف طور پر نظر آئے گا کہ ہمارے بزرگوں نے تعلیم وتصنیف، تبلیغ وجہاد، دعوت وارشاد وغیرہا دین کے شعبوں میں جو گرانقدر اور تاریخ ساز کارنامے انجام دیے ہیں، اس میں اصل کارفرمائی، اخلاص وایثار ہی کی تھی۔

اسی کے ساتھ آپ یہ بھی اچھی طرح جان لیجیے کہ کارگاہِ حیات میں دوسری چیز جو آپ کی سب سے بڑی معاون اور نیک نامی وسرخ روئی کی ضامن ہے، وہ آپ کا حسنِ اخلاق و نیک کردار ہے، آپ حسنِ اخلاق سے وہ سب کچھ حاصل کرسکتے ہیں جو دوسرے ذرائع سے حاصل نہیں ہوتے، آپ کا یہی وہ جوہر ذاتی ہے جو دشواریوں کو آسانی سے تاریکیوں کو روشنی سے اور ناکامیوں کو کامیابی سے ہم کنار کردے گا۔

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

آپ دینی تعلیم گاہوں سے اپنا تعلیمی نصاب مکمل کرکے جارہے ہیں، آپ انتہائی خوش قسمت ہیں کہ مالکِ کائنات نے آپ کو وارثین انبیاء کی صف میں شامل کردیا ہے، انسانی مقام ومرتبہ پر نبوت سے بالا وبلند تر کوئی مقام ودرجہ نہیں ہے؛ اس لیے لازمی طور پر وراثتِ نبوت سے بڑھ کر کوئی وراثت ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ آپ کی انتہائی سعادت مندی ونیک بختی ہے کہ رب العالمین نے اس عظیم ترین وراثت کے لیے آپ کا انتخاب فرمایا ہے، فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ؛ اس لیے ہرگز ہرگز مایوسی واحساسِ کمتری کا ادنیٰ تصور بھی دل ودماغ کے گرد بھٹکنے نہ پائے، آپ سے عظیم تر دولت اس عالم دنیا میں کسی کے پاس نہیں ہے اِلّا یہ کہ اس وراثتِ نبوت میں جو لوگ آپ کے شریک ہیں۔

پس اخلاص وایثار اخلاق وکردار کے چراغ سے اپنے دل کو روشن کرلیجئے! دنیا آپ سے اکتسابِ نور کے لیے امنڈ پڑے گی اور ناکامی ونامرادی کے اندھیرے چراغِ اخلاص واخلاق کی ضیاپاشیوں سے اس طرح کافور ہوجائیں گے کہ دور دور تک ان کا نام ونشان بھی نہیں ملے گا۔

کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمنِ دل کو
کہ خورشیدِ قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں

❁ ❁ ❁

کُفّار سے مشابہت اختیار کرنے کا شرعی حکم

از: محمد راشد ڈسکوی
رفیق شعبہ تصنیف وتالیف
واستاذ جامعہ فاروقیہ کراچی

تمام ادیان میں صرف دینِ اسلام کو ہی جامع، کامل واکمل ہونے کا شرف حاصل ہے، دنیا کے کسی خطے میں رہنے والا، کوئی بھی انسان ہو، کسی بھی زبان کا ہو، کسی بھی نسل کا ہو، اگر وہ اپنی زندی کے کسی بھی شعبے کے بارے میں راہنمائی لینا چاہتا ہو، تو اس کے لیے اسلام میں راہنمائی کا سامان موجود ہے، اگر کوئی انسان اسلام میں داخل ہو کر اسلام کی راہنمائی کے مطابق اپنی زندگی کو ترتیب دیتا ہے تو ایسے شخص کو دنیا و آخرت کی کامیابی کا مژدہ سنایا گیا ہے، اور اس کے برعکس کوئی مسلمان اپنی زندگی کے معمولات کے سرانجام دینے میں اسلامی احکامات کی طرف دیکھنے کے بجائے اسلام دشمن لوگوں کی طرف دیکھتا ہے (دیکھ کر ان کے طور طریقوں کو اختیار کرتا ہے، یہ طور طریقے، شکل وصورت میں ہوں یا لباس میں، کھانے میں ہوں یا سونے میں، معاملات میں ہوں یا معاشرت میں، اَخلاق میں ہوں یا کسی بھی طریقے میں ہوں) تو اس امر کو اسلام میں سخت ناپسند کیا گیا ہے، ایسے شخص کی پُر زور مذمت کرتے ہوئے اس کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے، سرکار دوعالم ﷺ نے صاف فیصلہ سنا دیا ہے کہ ''جو شخص دنیا میں کسی کی مشابہت اختیار کرے گا، کل قیامت میں اس کا حشر اسی شخص کے ساتھ ہوگا''؛ اس لیے بہت ضروری ہے کہ ہم اپنی زندگی کے کسی بھی موڑ پر، کسی بھی کام میں غیر مسلموں کا طریقہ یا مشابہت اختیار نہ کریں، ہماری مسلمانی کا تقاضیٰ بھی یہی ہے کہ ہم اپنے محبوب ﷺ کی صورت اور سیرت سے محبت کرتے ہوئے ان کی مبارک سنتوں کو اپنی زندگی میں جگہ دے کر اللہ تعالیٰ کے سامنے سرخرو ہوں اور اس خوفناک دن کی رسوایوں سے بچ سکیں۔

تشبہ کی تعریف

اپنی حقیقت ،اپنی صورت، ہیئت اور وجود کو چھوڑ کر دوسری قوم کی حقیقت ،اس کی صورت اختیار کرنے اوراس کے وجود میں مدغم ہو جانے کا نام تشبہ ہے۔(التنبہ علی مافي التشبہ للکاندھلویؒ، ص:۷،مکتبہ حکیم الامت کراچی)

شریعت مطہرہ مسلم وغیر مسلم کے درمیان ایک خاص قسم کا امتیاز چاہتی ہے کہ مسلم اپنی وضع قطع ،رہن سہن اور چال ڈھال میں غیر مسلم پر غالب اوراس سے ممتاز ہو،اس امتیاز کے لیے ظاہری علامت داڑھی اورلباس وغیرہ مقرر کی گئی کہ لباس ظاہری اور خارجی علامت ہے۔اورخود انسانی جسم میں داڑھی اور ختنہ کوفارق قرار دیا گیا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے موقع بہ موقع اپنے اصحاب رضوان اللہ علیہم کو غیر مسلموں کے مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ذیل میں ان میں سے کچھ احکامات ذکر کیے جاتے ہیں:

اللہ رب العزت کی طرف سے بواسطہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُمت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غیر مسلمین کفارو یہود اور نصاریٰ سے دور رکھنے کی متعدد مقامات پر تلقین کی گئی ،مثلاً:

﴿يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لاَ تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارىٰ أولياء، بَعْضُهُمْ أولياءُ بَعْضٍ، وَّمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ، فإِنّه مِنْهُمْ، إنّ اللّٰهَ لاَ يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (المآئدة: ۵۱)

ترجمہ:”اے ایمان والو! مت بناو یہود اور نصاریٰ کو دوست ،وہ آپس میں دوست ہیں ایک دوسرے کے، اور جو کوئی تم میں سے دوستی کرے اِن سے ،تو وہ انہی میں سے ہے، اللہ ہدایت نہیں دیتا ظالم لوگوں کو“۔(تفسیر عثمانی ،ص:۱۵۰)

﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لاَ تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (آل عمران: ۱۵۶)

ترجمہ:اے ایمان والوتم نہ ہو(جاوٴ) ان کی طرح جو کافر ہوئے۔(تفسیر عثمانی ،ص:۹۰)

سنن ترمذی میں ایک روایت ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

”جو شخص ملتِ اسلامیہ کے علاوہ کسی اور امت کے ساتھ مشابہت اختیار کرے تو وہ ہم میں سے نہیں، اِرشاد فرمایا کہ تم یہود اور نصاری کے ساتھ مشابہت اختیار نہ کرو“۔

(سنن الترمذي ، كتاب الاستيذان، رقم الحديث: ۲۶۹۵)

اس حدیث کی شرح میں صاحب تحفة الأحوذي لکھتے ہیں کہ

مراد یہ ہے کہ تم یہود و نصاریٰ کے ساتھ ان کے کسی بھی فعل میں مشابہت اختیار نہ کرو۔ (تحفۃ الاحوذی: ۵۰۴/۷)

سنن ابی داؤد میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

''جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے گا وہ انہی میں سے ہوگا''. (سنن ابو داؤد، کتاب اللباس، رقم الحدیث: ۴۰۳۰)

علامہ سہارنپوریؒ لکھتے ہیں کہ مشابہت عام ہے، خیر کے کاموں میں ہو یا شر کے کاموں میں، انجام کار وہ ان کے ساتھ ہوگا، خیر یا شر میں۔ (بذل المجہود: ۵۹/۴)

"مَنْ تَشَبَّهَ" کی شرح میں ملا علی القاریؒ لکھتے ہیں کہ:

''جو شخص کفار کی، فساق کی، فجار کی یا پھر نیک وصلحاء کی، لباس وغیرہ میں (ہو یا کسی اور صورت میں) مشابہت اختیار کرے وہ گناہ اور خیر میں ان کے ہی ساتھ ہوگا۔ (مرقاۃ المفاتیح، کتاب اللباس، رقم الحدیث: ۴۳۴۷، ۲۲۲/۸، رشیدیہ)

ایک اور حدیثِ رسول ﷺ میں ہے:

''ہم میں، اور مشرکین کے درمیان فرق (کی علامت) ٹوپیوں پر عمامہ کا باندھنا ہے''۔ یعنی: ہم ٹوپی پر عمامہ باندھتے ہیں اور مشرکین بغیر ٹوپی کے عمامہ باندھتے ہیں۔ (سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، رقم الحدیث: ۴۰۷۸۔ مرقاۃ المفاتیح، رقم الحدیث: ۴۳۴۰، ۲۱۵/۸)

تشبہ کے بارے میں آثارِ صحابہ وتابعین:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں جب سلطنتِ اسلامیہ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا تو حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو اس بات کی فکر دامن گیر ہوئی کہ مسلمانوں کے عجمیوں کے ساتھ اختلاط کی وجہ سے اسلامی امتیازات میں کوئی فرق نہ آجائے، اس خطرے کے پیشِ نظر آپ رضی اللہ عنہ نے ایک طرف مسلمانوں کو اس سے بچنے کی تلقین کی، تو دوسری طرف غیر مسلمین کے لیے بھی دستور قائم کیا۔

جیسا کہ حضرت ابوعثمان النہدی رحمہ اللہ کی روایت ہے کہ ہم عتبۃ بن فرقد کے ساتھ آذربائیجان میں تھے کہ ہمارے پاس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک خط بھیجا (جس میں بہت

سارے احکامات و ہدایات تھیں، منجملہ ان کے ایک ہدایت یہ بھی تھی کہ) ''تم اپنے آپ کو اہلِ شرک اور اہلِ کفر کے لباس اور ہیئت سے دور رکھنا''۔

(جامع الأصول، الكتاب الأول في اللباس، الفصل الرابع في الحرير، النوع الثاني، رقم الحديث: ٨٣٤٣، ١٠ / ٦٨٧، مكتبة دار البيان)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے لکھا تھا کہ

''اے مسلمانوں! ازار اور چادر کا استعمال رکھو اور جوتے پہنو.... اور اپنے جدِ امجد اسماعیل علیہ السلام کے لباس (لنگی اور چادر) کو لازم پکڑو اور اپنے آپ کو عیش پرستی اور عجمیوں کے لباس اور ان کی وضع قطع اور ہیئت سے دور رکھو، (مبادا کہ تم لباس اور وضع قطع میں عجمیوں کے مشابہ بن جاؤ)....اور موٹے، کھردرے اور پرانے لباس پہنو' (شعب الایمان، رقم الحدیث ۵۷۷۶، ج ۸، ص ۲۵۳)

اور دوسری طرف اہلِ نصاریٰ اور یہود کو دارالاسلام میں رہنے کی صورت میں بہت سے اُمور کا پابند کیا، جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بہت ہی مظبوط انداز میں اسلامی تہذیب وتمدن اور اسلامی اَقدار کی حفاظت کی گئی ہے۔

چنانچہ! فتح شام کے موقع پر نصاریٰ شام کے عہدِ صلح کے بعد جو شرائط طے کی گئیں وہ یہ تھیں:

''ہم (نصاریٰ شام) مسلمانوں کی تعظیم وتوقیر کریں گے، اور اگر مسلمان ہماری مجالس میں بیٹھنا چاہیں گے تو ہم ان کے لیے مجلس چھوڑ دیں گے، اور ہم کسی امر میں مسلمانوں کے ساتھ تشبہ اور مشابہت اختیار نہیں کریں گے، نہ لباس میں، نہ عمامہ میں، نہ جوتے پہننے میں، اور نہ سر کی مانگ نکالنے میں، ہم اُن جیسا کلام نہیں کریں گے، اور نہ مسلمانوں جیسا نام اور کنیت رکھیں گے، اور نہ زین کی سواری کریں گے، نہ تلوار لٹکائیں گے، نہ کسی قسم کا ہتھیار بنائیں گے، اور نہ اُٹھائیں گے، اور نہ اپنی مہروں پر عربی نقش کندہ کروائیں گے، اور سر کے اگلے حصے کے بال کٹوائیں گے، اور ہم جہاں بھی رہیں گے، اپنی ہی وضع پر رہیں گے، اور گلوں میں زنار لٹکائیں گے، اور اپنے گرجاؤں پر صلیب کو بلند نہ کریں گے، اور مسلمانوں کے کسی راستہ اور بازار میں اپنی مذہبی کتاب شائع نہیں کریں گے، اور ہم گرجاؤں میں ناقوس نہایت آہستہ آواز میں بجائیں گے، اور ہم اپنے مُردوں کے ساتھ آگ لے کر نہیں جائیں گے (یہ آخری شرط مجوسیوں سے متعلق ہے)۔

حضرت عبدالرحمٰن بن غنم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ شرائط نامہ لکھ کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے ملاحظہ کرنے کے لیے رکھا، تو انہوں نے اس شرائط نامہ میں کچھ مزید اضافہ کروایا جو یہ تھا:

''ہم کسی مسلمان کو ماریں گے نہیں، یعنی تکلیف نہیں پہنچائیں گے، ہم نے انہی شرائط پر اپنے لیے اور اپنے اہلِ مذہب کے لیے امان حاصل کیا ہے، پس اگر ہم نے شرائط مذکورہ بالا میں سے کسی شرط کی خلاف ورزی کی تو ہمارا عہد اور امان ختم ہو جائے گا اور جو معاملہ اہلِ اسلام کے دشمنوں اور مخالفوں کے ساتھ کیا جاتا ہے وہی معاملہ ان کے ساتھ کیا جائے گا'' (تفسیر ابن کثیر، سورہ توبۃ:۲۹)

ایک اور روایت جسے علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے، اس میں کچھ مزید شرائط کا بھی ذکر ہے، جو ذیل میں ذکر کی جاتی ہیں:

''ہم اپنی آبادی میں کوئی نیا گرجا گھر نہیں بنائیں گے، اور جو گرجا گھر خراب ہو جائیں گے، اس کی مرمت نہیں کروائیں گے، اور جو خطۂ زمین مسلمانوں کے لیے ہوگا، ہم اُسے آباد نہیں کریں گے، اور کسی مسلمان کو دن ہو یا رات، کسی وقت بھی گرجا میں اُترنے سے نہیں روکیں گے، اور اپنے گرجاؤں کے دروازے مسافروں اور گزرنے والوں کے لیے کشادہ رکھیں گے، اور تین دن تک ان مسلمان مہمانوں کی مہمان نوازی کریں گے، اور اپنے کسی گرجا اور کسی مکان میں مسلمانوں کے خلاف جاسوسی کرنے والے کو ٹھکانہ نہیں دیں گے، اور مسلمانوں کے لیے کسی غل وغش کو پوشیدہ نہیں رکھیں گے، اور اپنی اولاد کو قرآن کی تعلیم نہیں دیں گے، اور کسی شرک کی رسم کو ظاہراً اور اعلانیہ طور پر نہیں کریں گے، اور نہ کسی کو شرک کی دعوت دیں گے، اور نہ اپنے کسی رشتہ دار کو اسلام میں داخل ہونے سے روکیں گے''۔

مذکورہ بالا شرائط کو دیکھتے ہوئے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے اسلامی تہذیب و تمدن اور تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے کس قدر اہتمام کیا گیا؛ اس لیے کہ اسلام میں غیروں کے طور طریقوں کا داخل ہو جانا مسخِ اسلام اور تخریبِ اسلام ہے۔

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''تشبہ بالغیر فی الحقیقت تخریبِ حدود اور ابطالِ ذاتیات کا نام ہے''۔ (مجموعہ رسائل حکیم الاسلام،

اسلامی تہذیب وتمدن: ۴۸۵/۵)

غیروں کے ساتھ اختلاط، میل جول اختیار کرنے سے کس قدر سختی سے اور کن کن طریقوں سے روکا گیا، اس کا اندازہ اس مکالمے سے بخوبی ہوسکتا ہے جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے درمیان ہوا، وہ یہ ہے:

''حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میرے یہاں ایک نصرانی کاتب ملازم ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تجھے کیا ہوگیا؟ خدا تجھے غارت کرے! کیا تو نے اللہ کا یہ حکم نہیں سنا کہ ''یہود ونصاریٰ کو اپنا دوست مت بناؤ؛ کیوں کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں''۔ تو نے کسی مسلمان کو ملازم کیوں نہیں رکھا؟

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جواب دیا کہ اے امیر المؤمنین! میرے لیے اس کی کتابت ہے اور اس کے لیے اس کا اپنا دین۔ (یعنی: وہ نصرانی ہے تو کیا ہوا، مجھے تو اس کی کتابت سے غرض ہے، میرا اس کے دین سے کیا تعلق؟)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جن کی اہانت اللہ تعالیٰ نے کی ہے، میں ان کی تکریم نہیں کروں گا، جن کو اللہ تعالیٰ نے ذلیل کیا ہے میں ان کو عزت نہیں دوں گا، جن کو اللہ تعالیٰ نے دور کیا ہے میں ان کو قریب نہیں کروں گا'' (المستطرف: ۶۰/۲)۔

اس پرمغز مکالمے سے یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے کہ

(۱) جب تک کوئی اضطراری حالت داعی نہ ہو اس وقت تک اصل یہی ہے کہ غیر مسلمین سے استغناء اور وہ بھی ایسا کہ جس میں ان کی تکریم ہوتی ہو، دینِ متین کی فہم حقیقی اور عقل ودانش اس کی اجازت نہیں دیتی۔

(۲) یہ عذر قابلِ سماعت نہیں ہے کہ ہمیں تو ان کی صرف خدمات درکار ہیں، نہ کہ ان کا مذہب؛ کیوں کہ اس تحصیلِ خدمت کے ذیل میں ان کے ساتھ معیت ہماری اس شدت اور تغلیظ کو کم کردے گی یا محو کردے گی جو ایک مسلمان کا اسلامی شعار بتایا گیا ہے، اور یہی قلتِ تغلیظ بالآخر مداہنت وچشم پوشی اور اعراض عن الدین کا مقدمہ بن کر کتنے ہی شرعی منکرات کی نشو ونما کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

(۳) حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے بعد کوئی شخص ان جیسا تدین نہیں لاسکتا؛ لیکن اگر کوئی شخص بالفرض لے بھی آئے تو کوئی وجہ نہیں کہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو تو کفار کی خدمات حاصل کرنے سے روکا جائے اور اسے نہ روکا جائے۔

یہ بات تسلیم کی جاسکتی ہے کہ ایک شخص پختہ اور راسخ الایمان بھی ہے اور اس اشتراکِ عمل سے اس میں کوئی تزلزل بھی نہیں آسکتا؛ لیکن یہ تو ہوسکتا ہے کہ ایسی ذمہ دار ہستی کا اشتراکِ عمل، عامۃ المسلمین کے لیے کفار سے استعانت اور اختلاط کے معاملے میں شبہ کا باعث بن جائے اور عوام اپنے لیے اس فعل کو حجت شمار کریں اور اس طرح یہ اختلاط والتباس عام ہوکر ناقابلِ تدارک مفاسد کا باعث بن جائے۔

(۴) جس مخلوق کی اس کے خالق نے تکریم نہ کی، اور ان کے لیے عزت کا کوئی شمہ گوارا نہ کیا، تو اُسی خالق کے پرستاروں کی غیرت وحمیت کے خلاف ہے کہ وہ اس کے اعداء کی تکریم کریں، وہ جسے پھٹکار دے، یہ اس سے پیار کریں۔

(۵) اسلام میں سیاستِ محضہ مقصود نہیں؛ بلکہ محض دین مقصود ہے، سیاسی الجھنیں محض تحفظِ دین کے لیے برداشت کی جاتی ہیں، پس اگر کوئی سیاست ہی کا کوئی شعبہ تخریبِ دین یا مداہنت و حق پوشی کا ذریعہ بننے لگے، تو بے دریغ اس کو قطع کرکے دین کی حفاظت کی جائیگی، ورنہ بصورتِ خلاف قلبِ موضوع لازم آجائے گا کہ وسیلہ مقصود ہوجائے اور مقصود وسیلہ کے درجہ پر بھی نہ رہے گا۔ (مجموعہ رسائل حکیم الاسلام، اسلامی تہذیب وتمدن: ۵/۹۷، ۹۸)

تشبہ بالکفار کے مفاسد:

غیروں کی وضع قطع اور ان جیسا لباس اختیار کرنے میں بہت سے مفاسد ہیں:

(۱) پہلا نتیجہ تو یہ ہوگا کہ کفر اور اسلام میں ظاہراً کوئی امتیاز نہیں رہے گا، اور ملتِ حقہ، ملتِ باطلہ کے ساتھ ملتبس ہوجائے گی، سچ پوچھیے تو حقیقت یہ ہے کہ ''تشبہ بالنصاریٰ'' (معاذ اللہ) نصرانیت کا دروازہ اور دہلیز ہے۔

(۲) دوم یہ کہ غیروں کی مشابہت اختیار کرنا غیرت کے بھی خلاف ہے، آخر دینی نشان اور دینی پہچان بھی تو کوئی چیز ہے، جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ شخص فلاں دین کا ہے، پس اگر یہ ضروری ہے تو اس کا طریقہ سوائے اس کے اور کیا ہے کہ کسی دوسری قوم کا لباس نہ پہنیں، جیسے اور قومیں اپنی

اپنی وضع کی پابند ہیں، اسی طرح اسلامی غیرت کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ ہم اپنی وضع کے پابند رہیں، اور دوسری قوموں کے مقابلہ میں ہماری خاص پہچان ہو۔

(۳) کافروں کا معاشرہ، تمدن اور لباس اختیار کرنا در پردہ ان کی سیادت اور برتری کو تسلیم کرنا ہے؛ بلکہ اپنی کمتری اور تابع ہونے کا اقرار اور اعلان ہے، جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

(۴) نیز! اس تشبہ بالکفار کا نتیجہ یہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ کافروں سے مشابہت کا دل میں میلان اور داعیہ پیدا ہوگا، جو صراحۃً نصِ قرآنی سے ممنوع ہے:

وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ، وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُونَ. (الهود: ۱۱۳)

ترجمہ: اور تم ان کی طرف مت جھکو، جو ظالم ہیں، مبادا ان کی طرف مائل ہونے کی وجہ سے تم کو آگ نہ پکڑ لے، اور اللہ کے سوا کوئی تمھارا دوست اور مددگار نہیں، پھر تم کہیں مدد نہ پاؤ گے۔

بلکہ غیر مسلموں کا لباس اور شعار اختیار کرنا ان کی محبت کی علامت ہے، جو شرعاً ممنوع ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارٰى أَوْلِيَاءَ، بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ، وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ، فَإِنَّهُ مِنْهُمْ، إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ. (المآئدة: ۵۱)

ترجمہ: اے ایمان والو! تم یہود و نصاریٰ کو دوست مت بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست اور رفیق ہیں، وہ تمھارے دوست نہیں اور تم میں سے جو ان کو دوست بنائے گا، وہ انہی میں سے ہوگا، تحقیق اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔

(۵) اس کے بعد رفتہ رفتہ اسلامی لباس اور اسلامی تمدن کے استہزاء اور تمسخر کی نوبت آئے گی، اسلامی لباس کو حقیر سمجھے گا، اور تبعاً اس کے پہننے والوں کو بھی حقیر سمجھے گا، اگر اسلامی لباس کو حقیر نہ سمجھتا تو انگریزی لباس کو کیوں اختیار کرتا؟

(۶) اسلامی احکام کے اجراء میں دشواری پیش آئے گی، مسلمان اس کافرانہ صورت کو دیکھ کر گمان کریں گے کہ یہ کوئی یہودی یا نصرانی ہے، یا ہندو ہے، اور اگر کوئی ایسی لاش مل جائے تو تردد ہوگا کہ اس کافرنما مسلمان کی نمازِ جنازہ پڑھیں یا نہیں؟! اور کس قبرستان میں دفن کریں؟

(۷) جب اسلامی وضع کو چھوڑ کر دوسری قوم کی وضع اختیار کرے گا تو قوم میں اس کی کوئی عزت باقی نہیں رہے گی، اور جب قوم ہی نے اس کی عزت نہ کی تو غیروں کو کیا پڑی ہے کہ وہ اس

کی عزت کریں، غیر بھی اُسی کی عزت کرتے ہیں جس کی قوم میں عزت ہو۔

(۸) دوسری قوم کا لباس اختیار کرنا اپنی قوم سے لاتعلقی کی علامت ہے۔

(۹) افسوس! کہ دعویٰ تو ہے اسلام کا؛ مگر لباس، طعام، معاشرت، تمدن، زبان اور طرزِ زندگی سب کا سب اسلام کے دشمنوں جیسا! جب حال یہ ہے تو اسلام کے دعوے ہی کی کیا ضرورت ہے؟! اسلام کو ایسے مسلمانوں کی نہ کوئی حاجت ہے اور نہ ہی کوئی پرواہ کہ جو اس کے دشمنوں کی مشابہت کو اپنے لیے موجبِ عزت اور باعثِ فخر سمجھتے ہوں۔ (التنبہ علی مافي التشبہ للکاندھلويؒ: ۱۶ تا ۲۰)

تشبہ کے فقہی اعتبار سے مراتب

تشبہ کی ممانعت اور مفاسد اچھی طرح ظاہر ہوجانے کے بعد جاننا چاہیے کہ تشبہ بالکفار کے وہ کون سے مراتب ہیں، جن سے تشبہ کے جواز، عدمِ جواز، حرمت و کراہت، استحسان وعدمِ استحسان اور امکان وعدمِ امکان کی تفصیلات واضح ہوکر سامنے آسکیں۔

چناں چہ انسان سے صادر ہونے والے افعال واعمال کی دو ہی قسمیں ہوسکتی ہیں: اضطراری امور اور اختیاری امور۔ ذیل میں ہر دو قسموں پر تفصیلی بحث نقل کی جاتی ہے۔

اضطراری امور میں تشبہ اختیار کرنے کا حکم

اضطراری امور سے مراد وہ امور ہیں جن کے ایجاد وعدمِ ایجاد میں انسانی اختیارات کو کوئی دخل نہیں ہوتا، مثلاً: انسان کی خلقی اوضاع واطوار اور جبلّی اقتضاءات، یعنی اس کے اعضاءِ بدن، چہرہ مہرہ، پھر اس کے ذاتی عوارض، مثلاً: بھوک پیاس لگنا، اس اندرونی داعیہ کی بناء پر کھانے پینے پر مجبور ہونا، اپنے بدن کو ڈھانپنا وغیرہ ایسے امور ہیں جو اضطراری ہیں اور وہ نہ بھی چاہے، تب بھی یہ جذبات اس کے دل پر ہجوم کرتے رہتے ہیں۔

تو ظاہر ہے کہ شریعت ایسے امور میں انسان کو خطاب نہیں کرتی، یہ امور کفار وغیر کفار میں مشترک ہیں، یہ نہیں کہا جائے گا کہ منعِ تشبہ کی وجہ سے اس اشتراک کو ختم کیا جائے، یعنی: شریعت ان امور میں یہ نہیں کہتی کہ چوں کہ کفار کھانا کھاتے ہیں تو ان کی مشابہت کو ترک کرتے ہوئے تم کھانا نہ کھاؤ، یا چوں کہ وہ (کفار) لباس پہنتے ہیں تم ان کی مشابہت سے بچنے کے لیے لباس نہ پہنو، یا چوں کہ ان کے ہاتھ، پیر، ناک، کان ہیں تم ان کی مخالفت میں اپنے یہ اعضاء کاٹ ڈالو؛

بلکہ شریعت اس بات کا حکم دیتی ہے کہ تم کھانا تو ضرور کھاؤ لیکن تم کھانے کے طریقے کو ترکِ تشبہ کے ذریعے ممتاز ضرور بناؤ؛ کیوں کہ یہ تمہارا اختیاری فعل ہے، اضطراری نہیں۔ اسی طرح شریعت یہ نہیں کہتی کہ ترکِ تشبہ کے جوش میں تم لباس پہننا ہی ترک کردو؛ لیکن یہ ضرور کہتی ہے کہ تم لباس کی وضع قطع کو غیر اقوام کے لباس سے ممتاز اور نمایاں رکھو کہ یہ ضرور تمہارے حدود واختیار میں ہے۔

شریعت کبھی یہ نہیں کہے گی کہ اپنے اعضاءِ بدن کاٹ ڈالو کہ یہ تمہارے اعضاءِ جوارح غیر مسلم اقوام کی طرح ہیں؛ اس لیے بوجہ مشابہت یہ نہیں ہونے چاہئیں، ہاں یہ ضرور کہے گی کہ ٹھیک ہے کہ ان کا وجود میں آنا تمہارے اختیار یا ایجاد سے نہیں ہوا لیکن تمہارے ان اعضاء کی تزیین اور بناؤ سنگھار کا غیر اقوام سے ممتاز اور نمایاں ہونا تو تمہارے اختیار کا ہی فعل ہے، وہ چھوٹنے نہ پائے۔

اختیاری امور میں تشبہ ختیار کرنے کا حکم

اس کے بعد انسان سے صادر ہونے والے افعال اختیاری طور پر صادر ہوتے ہیں، ان اختیاری امور کی دو قسمیں ہیں: مذہبی امور اور معاشرتی وعادی امور۔

مذہبی امور میں تشبہ کا حکم

مذہبی امور سے مراد وہ امور واعمال ہیں، جن کا تعلق مذہب سے ہو، یعنی: ان افعال واعمال کو عبادت کے طور پر کیا جاتا ہو، جیسے: نصاریٰ کی طرح سینے پر صلیب لٹکانا، ہندوؤں کی طرح زنار باندھنا یا پیشانی پر قشقہ لگانا، یا سکھوں کی طرح ہاتھ میں لوہے کا کڑا پہننا وغیرہ، تو اس قسم کے مذہبی امور میں غیر اقوام کی مشابہت اختیار کرنا بالکلیہ ناجائز اور حرام ہے۔

معاشرت وعادی امور میں تشبہ کا حکم

معاشرتی وعادی امور بھی دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ امور جو قبیح بالذات ہیں، یعنی: وہ امور جن سے شریعت نے براہِ راست منع کیا ہے کہ ان افعال کو نہ کیا جائے؛ دوسرے: وہ امور جو مباح بالذات ہیں، یعنی: وہ امور جن سے شریعت نے براہِ راست تو منع نہیں کیا؛ لیکن دیگر خارجی امور کی وجہ سے وہ ممنوع قرار دیے جاتے ہیں۔

قبیح بالذات امور میں تشبہ کا حکم

قبیح بالذات امور میں غیر مسلم اقوام کی مشابہت اختیار کرنا بھی حرام ہے، جیسے: ٹخنوں سے نیچے شلوار لٹکانا، ریشمی لباس استعمال کرنا، یا کسی قوم کی ایسی حرکت کی نقل اتارنا جن میں ان کے معبودانِ باطلہ کی تعظیم ہوتی ہو، جیسے: بتوں کے آگے جھکنا وغیرہ، ان افعال میں تشبہ کی حرمت اس وجہ سے ہے کہ یہ امور قبیح بالذات ہیں، شریعت کی طرف سے ان کی ممانعت صاف طور پر آئی ہے۔

مباح بالذات امور میں تشبہ کا حکم

اگر وہ امور اپنی ذات کے اعتبار سے قبیح نہ ہوں؛ بلکہ مباح ہوں تو ان کی بھی دو صورتیں ہیں، ایک: وہ امور کسی غیر قوم کا شعار (یعنی: علامتی وشناختی نشان) ہوں، دوسرے: وہ افعال جو کسی غیر قوم کا شعار نہ ہوں، ہر دو کی تفصیل ذیل میں لکھی جاتی ہے:

غیر اقوام کے شعار میں مشابہت کا حکم

اگر وہ (مباح بالذات) امور غیر مسلم اقوام کے شعار (یعنی: علامتی وشناختی نشان) میں سے ہوں تو ان امور میں غیر اقوام کی مشابہت اختیار کرنا حرام ہے، مثلاً: غیر مسلم اقوام کا وہ لباس جو صرف انہی کی طرف منسوب ہو اور انہی کی نسبت سے مشہور ہو اور اس مخصوص لباس کو استعمال کرنے والا انہی میں سے سمجھا جاتا ہو، جیسے: بدھی اور قشقہ۔

مطلقاً غیروں کے افعال میں مشابہت کا حکم

اور اگر وہ مباح بالذات امور غیر مسلم اقوام کے شعار میں سے نہیں ہیں، تو پھر ان افعال کی دو قسمیں ہیں کہ ان افعال کا بدل مسلمانوں کے پاس موجود ہے یا ان کا بدل مسلمانوں کے پاس موجود نہیں ہے، ان دونوں قسموں میں مشابہت کا حکم ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

ذی بدل اشیاء میں غیروں کی مشابہت کا حکم

اگر ان مباح بالذات امور میں مسلمانوں کے پاس امتیازی طور ایسے طور طریقے موجود

ہوں جو کفار کے طور طریقوں کے مشابہ نہ ہوں تو ایسے امور میں غیروں کی مشابہت مکروہ ہے، کیوں کہ اسلامی غیرت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم ان اقوام کی ان اشیاء کا استعمال بھی ترک کردیں جن کا بدل ہمارے پاس موجود ہو، ورنہ یہ مسلم اقوام کے لیے عزت کے خلاف ایک چیز ہوگی اور بلا ضرورت خوامخواہ دوسروں کا محتاج و دستِ نگر بننا پڑے گا۔

جیسا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے کسی کے ہاتھ میں فارسی کمان (یعنی: ملکِ ایران کی بنی ہوئی کمان) دیکھی تو ناخوشی سے ارشاد فرمایا کہ ''یہ کیا لیے ہوئے ہو؟ اسے پھینک دو اور عربی کمان اپنے ہاتھ میں رکھو، جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے تمہیں قوت و شوکت دی اور بلادِ ارض کو مفتوح کیا''۔

(سنن ابن ماجة، باب السلاح، رقم الحديث: ۲۸۱۰)

فارسی کمان کا بدل عربی کمان موجود تھا؛ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے غیرت دلا کر روک دیا؛ تاکہ غیر اقوام کے ساتھ ہر ممکن امتیاز پیدا ہو سکے اور چھوٹے سے چھوٹے اشتراک کا بھی انقطاع ہو جائے۔

غیر ذی بدل اشیاء میں غیروں کی مشابہت کا حکم

اور اگر غیر اقوام کی اشیاء ایسی ہوں کہ ان کا کوئی بدل مسلم اقوام کے پاس موجود نہ ہو، جیسے آج یورپ کی نئی نئی ایجادات، جدید اسلحہ، تہذیب و تمدن کے نئے نئے سامان، تو اس کی پھر دو صورتیں ہیں یا تو ان کا استعمال تشبہ کی نیت سے کیا جائے گا یا تشبہ کی نیت سے نہیں کیا جائے گا، پہلی صورت میں استعمال جائز نہیں ہوگا؛ کیوں کہ تشبہ بالکفار کو مقصود بنالینا، ان کی طرف میلان و رغبت کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتا، اور کفار کی طرف میلان یقیناً اسلام کی چیز نہیں ہے؛ بلکہ اسلام سے نکال دینے والی چیز ہے۔

نیز! غیر مسلموں کی تقلید کسی مسلم کو بامِ عروج پر نہیں پہنچا سکتی، جیسا کہ ظلمت کی تقلید نور کی چمک میں، مرض کی تقلید صحت میں، اور کسی ضد کی تقلید دوسری ضد میں کوئی اضافہ و قوت پیدا نہیں کرسکتی، ہاں! اگر ان چیزوں میں تشبہ کی نیت نہ ہو؛ بلکہ اتفاقی طور پر یا ضرورت کے طور پر استعمال میں آرہی ہوں، تو ضرورت کی حد تک ان کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (مجموعہ رسائل حکیم الاسلام، اسلامی تہذیب و تمدن: ۱۲۸/۵- ۱۳۳، التنبہ علی مافي التشبہ للکاندھلویؒ، ص: ۸- ۱۲،

فیض الباری: ۱۵/۲، انوار الباری: ۱۰۵/۱۱، ۱۰۶)

خلاصۂ کلام

پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم مسلمان اپنی تہذیب اور اپنی اَقدار کو باقی رکھتے ہوئے ہر غیر مسلم قوم کے طور طریقوں سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی تحقیق

فرمایا: شعار کی بحث صرف ان امور میں چلے گی، جن کے بارے میں صاحبِ شرع سے کوئی ممانعت کا حکم موجود نہ ہو، ورنہ ہر ممنوعِ شرعی سے احتراز کرنا ضرور ہوگا، خواہ وہ کسی قوم کا شعار ہو یا نہ ہو، اس کے بعد جن چیزوں کی ممانعت موجود نہ ہو، اگر وہ دوسروں کا شعار ہوں تو ان سے بھی مسلمانوں کو اجتناب کرنا ضروری ہوگا، اگر وہ نہ رُکیں اور ان کا تعامل بھی دوسروں کی طرح عام ہو جائے یہاں تک کہ اس زمانے کے مسلمان صلحاء بھی ان کو اختیار کرلیں تو پھر ممانعت کی سختی باقی نہ رہے گی، جس طرح کوٹ کا استعمال ابتداء میں صرف انگریزوں کے لباس کی نقل تھی، پھر وہ مسلمانوں میں رائج ہوا یہاں تک کہ پنجاب میں صلحاء اور علماء تک نے اختیار کرلیا تو جو قباحت شروع میں اختیار کرنے والوں کے لیے تھی، وہ آخر میں باقی نہ رہی، اور حکم بدل گیا، لیکن جو امور کفار و مشرکین میں بطورِ مذہبی شعار کے رائج ہیں یا جن کی ممانعت صاحبِ شرع ﷺ نے صراحۃً کردی ہے، اُن میں جواز یا نرمی کا حکم کبھی بھی نہیں دیا جاسکتا۔ (انوار الباری: ۱۰۱/۵، فیض الباری: ۱۵/۲)

تشبہ سے متعلق اکابر علماء دیوبند کے فتاویٰ

لباس کی کن کن صورتوں میں تشبہ بالغیر ہے، اس کے بارے میں ہمارے علماء دیوبند نے وقتاً فوقتاً امتِ مسلمہ کی راہنمائی کی ہے، جن میں سے کچھ منتخب فتاویٰ نقل کیے جاتے ہیں، واضح رہے کہ لباس میں مشابہت (اگر وہ لباس غیروں کا مخصوص لباس نہ ہو تو اس) کا تعلق ہر ہر علاقے کے مزاج اور عرف کے ساتھ ہوتا ہے، ایک ہی چیز ایک شہر و علاقے میں عرف کی وجہ سے ناجائز ٹھہرتی ہے تو وہی چیز دوسرے علاقے میں عرف نہ ہونے کی وجہ سے جائز ہوتی؛ اس لیے اس معاملے میں اپنے علاقے کے ماہر و تجربہ کار مفتیانِ عظام سے رابطہ کرکے صورتِ حقیقی سے باخبر

رہنا ضروری ہوگا۔

پتلون پہننے کا حکم:

سوال: دورِ حاضر میں پتلون اور شرٹ پہننے کا اتنا رواج ہوگیا ہے کہ اب یہ کسی خاص قوم کا شعار نہیں رہا، نیز! قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لباس میں کوئی امتیازی نشان نہیں تھا، یہ بات اس خیال کو تقویت دیتی ہے کہ من تشبہ بقوم فھو منھم میں جس مشابہت کا ذکر ہے، مشابہتِ لباس اس میں داخل نہیں ہے؛ اس لیے پتلون اور شرٹ کا پہننا جائز معلوم ہوتا ہے، جناب اپنی تحقیق فرما کر ممنون فرمائیں، بینوا توجروا.

الجواب باسم ملھم الصواب:

آج کل کوٹ پتلون وغیرہ کا اگر چہ مسلمانوں میں عام رواج ہوگیا ہے؛ مگر اس کے باوجود اسے انگریزی لباس ہی سمجھا جاتا ہے، بالفرض تشبہ بالکفار نہ بھی ہو تو تشبہ بالفساق میں تو کوئی شبہ نہیں، لہٰذا ایسے لباس سے احتراز ضروری ہے۔

یہ کہنا صحیح نہیں کہ پہلے زمانہ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لباس میں کوئی امتیاز نہ تھا، نیز! اگر کسی زمانہ یا کسی علاقہ میں امتیاز نہ ہو تو وہاں تشبہ کا مسئلہ ہی پیدا نہ ہوگا، یہ مسئلہ تو وہاں پیدا ہوگا، جہاں غیر مسلم قوم کا کوئی مخصوص لباس ہو، احادیث میں غیر مسلموں کے مخصوص لباس سے ممانعت صراحۃً وارد ہوئی ہے۔

یہ تفصیل اس لباس کے بارے میں ہے، جس سے واجب الستر اعضاء کی بناوٹ اور حجم نظر نہ آتا ہو، اگر پتلون اتنی چست اور تنگ ہو اس سے اعضاء کی بناوٹ اور حجم نظر آتا ہو، جیسا آج کل ایسی پتلون کا کثرت سے رواج ہوگیا ہے، تو اس کا پہننا اور لوگوں کو دکھانا اور دیکھنا سب حرام ہے، جیسا کہ ننگے آدمی کو دیکھنا حرام ہے۔

(احسن الفتاویٰ، کتاب الحظر والاباحۃ، پتلون پھننے کا حکم: ۸/ ٦٤، ٦٥، ایچ ایم سعید)

مرد اور عورت کے لباس میں ایک دوسرے کی مشابہت

سوال: زعفران یا عصفر کے سوا تمام رنگ مرد کو شرعاً جائز ہیں؛ لیکن بعض علاقوں میں سیاہ

اور سرخ رنگ کے کپڑے عورتوں کا شعار سمجھے جاتے ہیں اور سفید کپڑے مردوں کا شعار سمجھے جاتے ہیں، کیا ان علاقوں میں مرد کو مختص بالنساء رنگوں کے کپڑے اور عورتوں کو مختص بالرجال رنگوں کے کپڑے پہننا جائز ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب: مرد اور عورت کو ایک دوسرے کے ساتھ تشبہ اختیار کرنا جائز نہیں؛ اس لیے ان علاقوں میں اس شعار کی رعایت رکھنا ضروری ہے، ایک دوسرے کا شعار اختیار کرنا جائز نہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم (احسن الفتاویٰ، کتاب الحظر والاباحۃ، مرد اور عورت کے لباس میں ایک دوسرے کی مشابہت: ۶۶/۸، ۶۷، ایچ ایم سعید)

ٹائی کا استعمال

سوال: کسی ملازمت میں ترقی کا معیار ٹائی باندھنے پر ہو تو ایسی صورت میں ٹائی باندھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: ٹائی ایک وقت میں نصاریٰ کا شعار تھا، اس وقت اس کا حکم بھی سخت تھا، اب غیر نصاریٰ بھی بکثرت استعمال کرتے ہیں، اب اس کے حکم میں تخفیف ہے، اس کو شرک یا حرام نہیں کہا جائے گا، کراہیت سے اب بھی خالی نہیں، کہیں کراہیت شدید ہوگی، کہیں ہلکی، جہاں اس کا استعمال عام ہو جائے، وہاں اس کے منع پر زور نہیں دیا جائے گا۔

اس پر محشی صاحب لکھتے ہیں: کہ ٹائی کا استعمال اگرچہ مسلمانوں میں بھی عام ہو گیا ہے؛ مگر اس کے باوجود انگریزی لباس کا حصہ ہی ہے، اگر انگریزی لباس تصور نہ کیا جائے؛ لیکن فساق و فجار کا لباس تو بہر حال ہے، لہٰذا تشبہ بالفساق کی وجہ سے ممنوع قرار دیا جائے گا۔ دوسری بات یہ کہ اہلِ صلاح اس لباس کو پسند بھی نہیں کرتے؛ کیوں کہ یہ علماء وصلحاء کے لباس کے خلاف ہے، تیسری بات یہ کہ اس کے علاوہ ٹائی میں ایک اور خرابی یہ بھی ہے کہ عیسائی اس سے اپنے عقیدہ "صلیب عیسیٰ علیہ السلام"، یعنی: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب کیے جانے کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جو کہ نص قرآنی کے خلاف ہے، لہٰذا تشبہ بالکفار کے ساتھ ساتھ عیسائیوں کی مذہبی یادگار اور مذہبی شعار ہونے کی وجہ سے بھی پہننا جائز نہیں:

"وعنه (أي: عن ابن عمر رضي الله تعالىٰ عنهما) قال: قال رسول الله ﷺ: "مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ" أي: مَنْ شَبَّهَ نَفْسَهُ بِالْكُفَّارِ، مثلاً: فِي اللِّبَاسِ وَغَيْرِهِ، أو بِالْفُسَّاقِ أَوْ

بِالْفُجَّارِ، أَوْ بِأَهْلِ التَّصَوُّفِ وَالصُّلَحَاءِ الأَبْرَارِ. "فَهُو مِنْهُمْ"، أي: في الإِثْمِ وَالْخَيْرِ". (مرقاة المفاتيح، كتاب اللباس، الفصل الثاني، رقم الحديث: ٤٣٤٧، ٨/ ١٥٥، رشيدية)

البتہ اگر ادارہ یا حکومت کی طرف سے پابندی ہو، نہ لگانے پر سزا دی جاتی ہو، یا کوئی اور رکاوٹ بنتا ہو تو اس صورت میں لگانے والے پر گناہ نہیں ہوگا؛ بلکہ اس ادارے یا حکومت کے ارکان پر گناہ عائد ہوگا، جس نے ایسا ضابطہ بنایا۔ (فتاویٰ محمودیہ، باب اللباس، ٹائی کا استعمال: ۱۹/ ۲۹۰، ادارۃ الفاروق)

ساڑھی پہننے کا حکم

سوال: تشبہ لباس وغیرہ کے بارے میں ایک استفسار یہ ہے کہ عورتوں کے لیے پیچ دار پائجامہ اور ساڑی جائز ہے یا نہیں؟ اور موٹی ساڑھی پہن کر نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جہاں یہ کفار وفساق کا شعار ہے، وہاں ناجائز ہے۔ جہاں عام ہے، ان کا شعار نہیں، وہاں جائز ہے۔ پھر اگر پردہ پورا ہو تو اس سے نماز بھی درست ہے۔ فقط: واللہ اعلم بالصواب (فتاویٰ محمودیہ، باب اللباس، فساق وفجار کا شعار: ۱۹/ ۲۹۰، ادارۃ الفاروق)

❁ ❁ ❁

حلال کی برکت اور حرام کی نحوست

از: مولانا یرید احمد نعمانی

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُواْ مِمَّا فِي الأَرْضِ حَلاَلاً طَيِّباً وَلاَ تَتَّبِعُواْ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ(١٦٨) إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَن تَقُولُواْ عَلَى اللّهِ مَا لاَ تَعْلَمُونَ(١٦٩) ……(سورة البقرة)

ترجمہ: ”اے لوگو! زمین میں جو کچھ حلال پاکیزہ چیزیں ہیں وہ کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ یقین جانو کہ وہ تمہارے لیے ایک کھلا دشمن ہے۔ وہ تو تم کو یہ حکم دے گا کہ تم بدی اور بے حیائی کے کام کرو اور اللہ کے ذمے وہ باتیں لگاؤ جن کا تمہیں علم نہیں ہے۔“ (آسان ترجمہٴ قرآن)

تشریح وتوضیح

شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نوراللہ مرقدہ پہلی آیت مبارکہ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں: ”اہل عرب بت پرستی کرتے تھے اور بتوں کے نام پر سانڈ بھی چھوڑتے تھے اور ان جانوروں سے نفع اٹھانا حرام سمجھتے تھے۔ یہ بھی ایک طرح کا شرک ہے؛ کیوں کہ تحلیل وتحریم کا منصب اللہ کے سوا کسی کو بھی نہیں۔ اس بارے میں کسی کی بات ماننی گویا اس کو اللہ کا شریک بنانا ہے؛ اس لیے اس سے پہلی آیات (۱۶۵-۱۶۷) میں شرک کی خرابی بیان فرما کر اب تحریم حلال سے ممانعت کی جاتی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ زمین میں پیدا ہوتا ہے، اس میں سے کھاؤ بشرطیکہ وہ شرعاً حلال اور طیب ہو، نہ تو فی نفسہ حرام ہو، جیسے مردار اور خنزیز اور **ما اهل به لغير الله** (جن جانوروں پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے اور اس کی قربت مقصود ان جانوروں کے ذبح سے ہو) اور نہ کسی امر عارضی سے اس میں حرمت آگئی ہو۔ جیسے غصب، چوری، رشوت، سود کا مال کہ ان سب سے اجتناب ضروری ہے۔ اور شیطان کی پیروی ہرگز نہ کرو کہ جس کو چاہا حرام کرلیا جیسے بتوں کے نام کے سانڈ وغیرہ اور جس کو چاہا حلال کرلیا جیسے **ما اهل به لغير الله** وغیرہ۔“ (تفسیر عثمانی: ص ۳۱)

”**وان تقولوا على الله مالا تعلمون**“ کے ذیل میں حضرتؒ فرماتے ہیں: ”یعنی مسئلے

اوراحکام شرعیہ اپنی طرف سے (نہ) بنالو۔جیسا کہ بہت سے مواقع میں دیکھا جاتا ہے کہ مسائل جزئیہ سے گزر کر امور اعتقادیہ تک نصوص شرعیہ کو چھوڑ کر، اپنی طرف سے احکام تراشے جاتے ہیں اور نصوص قطعیہ اوراقوال سلف کی تحریف اور تغلیط کرتے ہیں۔'' (حوالہ بالا)

آیات.... حدیث نبوی کے آئینے میں

اس مقام پر علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ عیاض بن حمارؓ کے حوالے سے ایک حدیث قدسی نقل کرتے ہیں، جس میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''میں نے اپنے بندوں کو جو مال دیا ہے، وہ ان کے لیے حلال ہے۔(اسی حدیث میں آگے فرمایا گیا) میں نے اپنے بندوں کو دین حنیف (کفروشرک سے بیزار اور اسلام کی طرف مائل دین) پر پیدا کیا۔ بعد میں شیاطین ان کے پاس آئے اور اُن کو ان کے دین سے متعلق گمراہ کرکے رکھ دیا اور جو چیزیں میں نے اپنے بندوں کے لیے حلال کررکھی تھیں، وہ ان پر حرام کردیں۔'' (ابن کثیر: ۱/ ۲۶۷)

کسب حلال اور رزق طیب کی بے شمار برکات ہیں۔ جب لقمہ حلال انسان کے پیٹ میں جاتا ہے تو اس سے خیر کے امور صادر ہوتے ہیں، بھلائیاں پھیلتی ہیں، وہ نیکیوں کی اشاعت کا سبب بنتا ہے۔ اس کے برعکس حرام غذا انسانی جسم کو معطل کردیتی ہے۔ نور ایمانی بجھ جاتا ہے، دل کی دنیا ویران وبنجر ہوجاتی ہے۔ شیطان اس کے قلب پر قابض ہوجاتا ہے۔ پھر ایسا شخص معاشرے کے لیے موذی جانور بن جاتا ہے۔ جس منہ کو حرام کی لت لگی ہو، اس سے بھلا امور خیر کیسے اور کیوں کر انجام پاسکتے ہیں۔ حلال وحرام کا یہ کھلا فرق اس حد تک اثر انداز ہوتا ہے کہ طیب وپاکیزہ کمائی کھانے والا عند اللہ مقبول ومستجاب بن جاتا ہے؛ جب کہ حرام وخبیث کو جزو بدن بنانے والا، اللہ تعالیٰ کے ہاں مردود ومطرود ٹھہرتا ہے۔ اسی بات کو کئی احادیث مبارکہ میں وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ آیت (یا ایھا الناس کلوا الخ) اللہ کے حبیب علیہ السلام کے روبرو تلاوت کی۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور فرمایا: ''یا رسول اللہ! میرے لیے اللہ تعالیٰ سے مستجاب الدعوات بننے کی دعا فرمادیں۔'' آپ علیہ السلام نے فرمایا: ''اے سعد! اپنا کھانا پاکیزہ اور حلال رکھو۔ تم مستجاب الدعوات بن جاؤ گے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں محمد کی جان ہے! حقیقت یہ ہے کہ جو آدمی اپنے پیٹ میں حرام کا لقمہ ڈالتا ہے تو چالیس دن تک (اس کی عبادات) قبول نہیں کی جاتیں۔ جس بندے کی نشو ونما حرام اور سود کے مال سے ہوئی ہو، جہنم کی

آگ اس کے زیادہ لائق ہے۔‘‘(ابن کثیر:۱/۲۶۷)

ایک دوسری حدیث مبارکہ میں، جو حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے، جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مال حرام کی قباحت وشناعت کو اس انداز میں ذکر فرمایا: ’’بے شک اللہ تعالیٰ پاک ہیں اور پاکیزہ مال ہی قبول فرماتے ہیں۔ اور اللہ رب العالمین (اپنے) مومن بندوں کو بھی اسی چیز کا حکم دیتے ہیں، جس کا حکم اپنے پیغمبروں کو دیا۔ پھر آپ علیہ السلام نے قرآن مجید کی یہ آیات تلاوت فرمائیں: **یا ایھا الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحا** (اے رسولو! پاکیزہ اور حلال چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو)....**یا ایھا الذین امنوا کلوا من الطیبات ما رزقنکم** (اے اہل ایمان! جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے، اس میں سے پاکیزہ اشیاء کھاؤ)

اس کے بعد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے آدمی کا تذکرہ فرمایا جو لمبے سفر میں پراگندہ حال اور غبار آلود (ہوتا) ہے۔ اور وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے ہوئے کہہ رہا ہو ’’اے میرے رب! اے میرے رب!‘‘ جب کہ (حقیقت حال یہ ہو کہ) اس کا کھانا، پینا اور اوڑھنا (سب) حرام ہے۔ اور حرام کی غذا اسے مل رہی ہو سو اس حالت میں اس کی دعائیں کیسے قبول ہوسکتی ہیں؟‘‘ (مشکوٰۃ:۲۴۱)

دیکھا جائے تو آج اکثر وبیشتر زبانوں پہ یہ شکوہ رہتا ہے کہ ’’اتنی دعائیں مانگتے ہیں پھر بھی ہماری حالت تبدیل نہیں ہوتی‘‘؛ حالاں کہ تھوڑے تدبر وتفکر سے کام لیا جائے تو ہمیں اپنے معاشرہ اور ماحول میں کسب حلال کی فکر وسوچ ہی مفقود نظر آتی ہے **إلّا ماشاء اللّٰہ**۔ عمومی فضا یہ بن چکی ہے کہ خواہشات کو ضروریات کا درجہ دے دیا گیا ہے؛ جب کہ انسانی خواہش تو بحر بے کنار کی مانند ہے۔ دنیا میں ہر آرزو اور تمنا پوری ہوجائے یہ ناممکن ہے۔ مستزاد یہ کہ ان لامحدود تمناؤں کو پورا کرنے کے لیے ہمارے درمیان ایک دوڑ لگی ہوئی ہے۔ ایک ہی خاندان میں شوہر کی خواہشیں الگ ہیں بیوی کی الگ۔ اولاد کسی اور چیز کے حصول کی امیدیں لگائی بیٹھی ہے تو ماں باپ کسی دوسری فکر میں ہلکان ہوئے جارہے ہیں، مال جمع کیا جارہا ہے۔ اور اس میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ذریعۂ آمدنی حلال ہے یا حرام، جائز ہے یا ناجائز، طیب ہے یا خبیث، حدودِ شرع کے اندر ہے یا باہر۔ یہ بالکل وہی صورت حال ہے، جسے ہمارے پیارے نبی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو برس قبل بیان فرمایا تھا۔ آپ علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے: ’’لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا، جس میں انسان اس بات کی طرف دھیان نہیں دے گا کہ وہ جو مال حاصل کررہا ہے؛ حلال ہے یا حرام۔‘‘ (مشکوٰۃ:۲۴۱)

جب انسان اکل حلال کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ صبر و قناعت، زہد و ایثار اور جفاکشی کی جگہ حرص وہوس اور عیش کوشی کو اپنا مطمح نظر بنا لیتا ہے تو اللہ رب کریم کی طرف سے نازل ہونے والی برکت ختم ہو جاتی ہے۔ جس کے بعد کثرت بھی قلت محسوس ہونے لگتی ہے۔ ایسے شخص کو قارون کا خزانہ بھی مل جائے تو وہ اسے کم تر جانتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب اپنے ناپاک مال میں سے اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہے تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جاتا۔ اس کے علاوہ یہ حرام بینک بیلنس جب تک اس کی ملکیت میں پڑا رہتا ہے، اس کے لیے دوزخ کی راہ ہموار کرتا رہتا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث مبارکہ میں اس حوالے سے یوں ارشاد فرمایا: ''بندہ مال حرام کما کر (جب) اس میں سے اللہ کے راستے میں کچھ خرچ کرتا ہے تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح (جب وہ مال حرام اپنی ذات پر خرچ کرتا ہے تو) اس میں اس کے لیے برکت پیدا نہیں کی جاتی۔ اور (اگر) اس مال حرام کو (ذخیرہ کی نیت سے) اپنے پاس محفوظ رکھتا ہے تو وہ اس کے لیے جہنم کا زادِ راہ بن جاتا ہے۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ برائی کو برائی سے نہیں؛ بلکہ اچھائی سے برائی کو مٹاتے ہیں؛ کیوں کہ خبیث چیز خبیث کو نہیں ختم کر سکتی۔'' (مشکوٰۃ: ۲۴۲)

حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری نور اللہ مرقدہ مذکورہ حدیث مبارکہ کے آخری جملے کی تشریح میں لکھتے ہیں: ''حرام مال سے صدقہ اور انفاق گناہ ہے اور یہ اُس گناہ کو نہیں مٹا سکتا جو کسب حرام سے حاصل ہوا ہے۔'' (حاشیہ مشکوٰۃ: ۲۴۲)

نکات ومعارف

۱.....''السوء والفحشاء''

آیت مبارکہ میں آنے والے ان دونوں لفظوں میں لغوی اعتبار سے کیا فرق ہے؟ اس کے بارے میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی قدس سرہ فرماتے ہیں: ''سوء'' وہ چیز جس کو دیکھ کر عقلمند شریف آدمی کو دکھ ہو۔ ''فحشاء'' بے حیائی کا کام۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ اس جگہ ''سوء'' سے مراد مطلق معصیت اور ''فحشاء'' سے مراد گناہ کبیرہ ہے۔'' (معارف القرآن: ۱/۴۱۱)

۲.....اِنَّمَا یأمرُکُم

شیطان کے امر اور حکم کرنے سے مراد دل میں وسوسہ ڈالنا ہے۔ جیسا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدم کے بیٹے کے قلب میں ایک شیطانی الہام واثر ہوتا ہے اور دوسرا فرشتہ کی طرف سے۔ شیطانی وسوسہ کا اثر یہ ہوتا ہے کہ برے کام کرنے کے فوائد اور مصالح سامنے آتے ہیں اور حق کو جھٹلانے کی راہیں کھلتی ہیں اور الہام

فرشتہ کا اثر یہ ہوتا ہے کہ خیر اور نیکی پر انعام وفلاح کا وعدہ اور حق کی تصدیق پر قلب مطمئن ہوتا ہے۔ (معارف القرآن:۱/۴۱۱)

۳.....خُطُوَاتِ الشیطان

حضرت قتادہ اور سدی رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ کی ہر نافرمانی "خطوات الشیطان" ہے۔ حضرت عکرمہؒ فرماتے ہیں: ''اس سے مراد شیطانی وساوس ہیں'' ابومجلزؒ فرماتے ہیں: ''اس سے مقصود گناہ کی نذر ہے۔'' حضرت شعبی فرماتے ہیں: ''ایک آدمی نے یہ نذر مانی کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کرے گا۔ حضرت مسروقؒ نے اسے ایک مینڈھا ذبح کرنے کا فتوی دیا اور فرمایا کہ یہ خطوات الشیطان میں سے ہے۔'' (ابن کثیر:۱/۲۶۷)

٤.....إنَّهٗ لَكُمْ عدوٌ مبين

یہاں ایک چھوٹا سا اشکال یہ ہے کہ زیر بحث آیت مبارکہ میں شیطان کو انسان کا کھلا دشمن کہا گیا ہے؛ لیکن دوسرے مقام پر فرمایا گیا: ''والذين كفروا أولياؤهم الطاغوت'' یعنی شیاطین کافروں کے دوست ہیں۔ ان دونوں باتوں میں بہ ظاہر تعارض ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے تفسیر مدارک کے مصنف رقم طراز ہیں: ''شیطان حقیقت میں تو انسان کا دشمن ہی ہے؛ لیکن ظاہراً دوست ہے۔ ظاہری طور پر وہ انسانوں کو اپنی دوستی دکھاتا ہے اور ان کے لیے بدی کے اعمال کو مزین وآراستہ کرتا ہے، مگر حقیقت میں اس طرح وہ ان کی تباہی وبربادی کا سامان کررہا ہوتا ہے۔'' (مدارک:۱/۹۷)

حاصل کلام

یہ ہے کہ حلت وحرمت انسانی ذہن کی اختراع نہیں؛ بلکہ یہ خالصتاً وحی پر مبنی ہے۔ شریعت مطہرہ جس امر کو حلال بتائے وہ طیب وطاہر اور جسے حرام قرار دے وہ ممنوع وناجائز ہے۔ جو کوئی شریعت کے معاملے میں عقل پرستی سے کام لے گا وہ شیطان کے راستے پر ہے۔ حیات مستعار میں کسب معاش اور شکم پری کے لیے پاکیزہ کمائی کے اسباب ڈھونڈنے اور اختیار کرنے چاہئیں۔ حرام خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اس سے پرہیز کرنا چاہیے؛ کیوں کہ صرف اور صرف طیب غذا سے معاشرہ سدھار کی طرف جاتا ہے، دعائیں قبول ہوتی ہیں، برکات نصیب ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حرام کے لقمہ سے محفوظ اور حلال کی قدر ومنزلت نصیب فرمائیں۔ آمین

❁ ❁ ❁

رشوت پر وعید اور اس کا شرعی حکم

از: مولانا غفران ساجد قاسمی
حی النسیم، ریاض، سعودی عرب
gsqasmi99@gmail.com

رشوت کیا ہے؟

آج جب کہ زمانہ بہت تیزی کے ساتھ ترقی کررہا ہے اور آئے دن نت نئی ایجادات سامنے آرہی ہیں، ایسے ترقی یافتہ دور میں رشوت کی کوئی خاص شکل وصورت متعین نہیں ہے، اور اب صرف کاغذ کے چندنوٹوں کے لین دین کا نام رشوت نہیں ہے؛ بلکہ زمانہ اور حیثیت کے اعتبار سے رشوت کی شکلیں بھی مختلف ہوتی رہتی ہیں، اگر کوئی عام آدمی کسی کلرک کو رشوت دیتا ہے تو وہ چندنوٹوں کی شکل میں ہوتا ہے، لیکن اگر یہی رشوت کوئی خاص شخص کسی بڑے عہدہ دار، مثلاً وزیر یا کسی بڑے صاحبِ منصب کو دیتا ہے تو وہ کبھی بنگلہ، موٹر کار یا پھر کسی بیرون ملک کے سیاحتی ٹکٹ وغیرہ کی شکل میں ہوتا ہے، جسے وہ ہدیہ یا نذرانہ کا خوبصورت نام دے دیتا ہے؛ لیکن درحقیقت وہ رشوت کی ترقی یافتہ شکل ہوتی ہے؛ اس لیے صرف کاغذ کے چندنوٹوں کے لین دین کو ہی رشوت نہیں کہہ سکتے، اس کے علاوہ بھی ہر وہ شئی جو اپنے جائز یا ناجائز مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے کسی اہل منصب کو دیا جائے گا وہ رشوت ہی ہوگا۔

مجمع البحار میں علامہ فتنی نے بھی رشوت کی تعریف کی ہے: ''رشوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص اپنی باطل غرض اور ناحق مطالبہ کے پورا کرنے کے لیے کسی ذی اختیار یا کارپرداز شخص کو کچھ دے''۔ (مجمع البحار بحوالہ علامہ سید سلیمان ندویؒ)

رشوت اسلام کی نظر میں:

رشوت کی مذمت اور اس کے لینے اور دینے والوں پر اللہ کے رسول ﷺ نے بڑی سخت وعیدیں بتائی ہیں، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا: ''رشوت لینے اور دینے والے پر اللہ کی لعنت برستی ہے''۔ (رواہ ابن ماجہ)

ایک دوسری حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''رشوت لینے اور دینے والا دونوں ہی دوزخ میں جائیں گے''۔ (طبرانی)

رشوت کی دلالی کرنے والا بھی ملعون:

اسلام کی نظر میں جس طرح رشوت لینے اور دینے والا ملعون اور دوزخی ہے، اسی طرح اس معاملہ کی دلالی کرنے والا بھی حدیث رسول کی روشنی میں ملعون ہے۔ صحابی رسول حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے اور دینے والے اور رشوت کی دلالی کرنے والے سب پر لعنت فرمائی ہے''۔ (رواہ احمد وطبرانی)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ قاضی کا کسی سے رشوت لے کر اس کے حق میں فیصلہ کرنا کفر کے برابر ہے، اور عام لوگوں کا ایک دوسرے سے رشوت لینا ''سُحت'' یعنی حرام ناپاک کمائی ہے۔ (طبرانی) یہی وجہ ہے کہ پوری امت رشوت کے حرام ہونے پر متفق ہے۔

رشوت دینے کی گنجائش کب ہوسکتی ہے؟

لغت میں ''رشوت'' کے معنی ہیں وہ نذرانہ جو اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے کسی کو پیش کیا جائے، خواہ وہ مقصد جائز ہو یا ناجائز؛ اسی لیے امام ابوسلیمان خطابیؒ اس حدیث کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''رشوت لینے اور دینے والے دونوں شخص گناہ وسزا کے مستحق اس وقت ہوں گے، جب کہ دونوں کا مقصد باطل اور ناحق کی حمایت کرنا ہو، کسی پر ظلم کرنا یا کرانا ہو یا شرعی حکم کی پامالی ہو، مثلاً ایک شخص جس کا ایک چیز میں شرعاً کوئی حق نہیں بنتا، وہ صاحب اختیار کو رشوت دے کر اپنے حق میں فیصلہ کرالیتا ہے یا ایک چیز ایک شخص کی ملکیت یا اس کا حق ہے، اس کے پاس ثبوت بھی ہیں، جو اس نے فراہم کردیے، مگر دوسرا شخص رشوت کے زور پر صاحب اختیار سے اس کے خلاف فیصلہ کرالیتا ہے، تاکہ حق دار کو اس کا حق نہ مل سکے، مذکورہ حدیث کی روشنی میں یہ رشوت دینا بلاشبہ لعنت کا سبب ہے۔

اسی طرح رشوت لینے والا شخص بھی وعید کا مصداق اس وقت ہوگا، جب اس نے ایسے حق یا عمل کی انجام دہی پر رشوت لی ہو جو اس کے اوپر از روئے شریعت واجب ہے، یا وہ کوئی کام ایسا کررہا ہے، جس کے کرنے کا کوئی جواز نہیں اور دوسرے کا اس سے نقصان ہورہا ہے، جب تک

اس کی مٹھی گرم نہ کی جائے، وہ اپنے اس ناحق عمل سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہ ہو، مندرجہ بالا حدیث کی روشنی میں ایسا شخص ملعون ہے۔

البتہ ایک شخص کا حق ہے کہ جو اسے ملنا چاہیے، رشوت دیے بغیر نہیں ملے گا، یا اتنی دیر سے ملے گا، جس میں اسے غیر معمولی مشقت برداشت کرنی پڑے گی۔ اسی طرح اس کے اوپر کسی فرد کی طرف سے ظالمانہ مطالبات عائد ہوگئے ہیں اور رشوت دیے بغیر ان سے خلاصی مشکل ہے تو امید ہے کہ دینے والا شخص گناہ گار نہ ہوگا، البتہ دیانت شرط ہے جس کی ذمہ داری خود اس پر ہوگی۔ اسی طرح ایک شخص حکام اور ارباب اختیار کے نزدیک اپنی ذاتی وجاہت کی وجہ سے باحیثیت مانا جاتا ہے، اگر ایسے شخص کے ذریعے اپنا جائز حق وصول کرنے کے لیے حاکم تک رسائی حاصل کی جائے اور وہ شخص جس پر اس کام کی شرعاً کوئی ذمہ داری نہیں ہے، حق الخدمت کے طور پر کچھ وصول کرتا ہے تو یہ اس کے لیے حلال ہوگا، کیوں کہ یہ نہ تو باطل کی اعانت ہے، نہ کسی پر ظلم ہے اور نہ ہی اس پر یہ کام کرنا از روئے شریعت واجب ہے، لیکن نہ لینا موجب اجر وثواب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: سفارش کردو، ثواب پاؤ گے۔ تجربہ شاہد ہے کہ جن ناگوار حالات میں رشوت دینی پڑتی ہے، ان میں دینے والا تو مجبور ہوتا ہے، مگر لینے والا مجبور نہیں ہوتا۔

رشوت اور قوم یہود کا شیوہ:

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اسلام سے قبل زمانۂ جاہلیت میں رشوت کے چلن پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ عرب کے کاہن اپنی مفروضہ غیبی طاقت کی بنا پر بعض مقدموں کے فیصلے کرتے تھے، اہل غرض ان کو اس کے لیے مزدوری یا رشوت کے طور پر کچھ نذرانہ دیتے تھے، اس کو حلوان (مٹھائی) کہتے تھے، اسلام آیا تو اوہام کا یہ دفتر ہی اڑ گیا، اس پر بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کاہن کے حلوان کی خاص طور سے ممانعت فرمائی۔ (ترمذی، باب ماجاء فی کراہیۃ مہر البغی)

اسی طرح عرب میں یہودیوں کے مقدمے ان کے احبار اور رئیس فیصل کرتے تھے، قانون کی زد سے بچنے کے لیے مال دار اور اہل ثروت طبقہ علانیہ رشوت دیتے اور ان کے کاہن اور قاضی یہ رشوت لے کر ان کے حق میں فیصلہ سنا دیتے تھے، اور اتنا ہی نہیں؛ بلکہ توراۃ کے احکام پر پردہ ڈالتے تھے۔ (صحیح بخاری) چنانچہ توراۃ کے قوانین میں تحریف کا ایک بڑا سبب یہی رشوت خوری تھی، قرآن مجید کی اس آیت میں اسی گناہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَا أَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ الْکِتَابِ وَیَشْتَرُوْنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا، أولٰئِکَ مَا یَأْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِہِمْ إلّا النَّارَ وَلَا یُکَلِّمُہُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَلَا یُزَکِّیْہِمْ وَلَہُمْ عَذَابٌ أَلِیْمٌ. (بقرۃ: ۲۱)

ترجمہ: خدا نے کتاب سے جو اتارا اس کو جو چھپاتے ہیں اور اس کے ذریعہ معمولی معاوضہ حاصل کرتے ہیں، وہ اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھرتے ہیں، خدا ان سے قیامت کے دن بات نہ کرے گا، نہ ان کو پاک صاف کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

پیٹ میں آگ بھرنے سے مراد یہی حرام کی کمائی رشوت ہے۔

عہد نبوت میں خیبر کے یہودیوں سے زمین کی آدھے آدھ پیداوار پر مصالحت ہوئی تھی، جب پیداوار کی تقسیم کا وقت آتا تو آں حضرت ﷺ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو بھیجتے، وہ ایمانداری سے پیداوار کے دو حصے کردیتے تھے اور کہہ دیتے تھے کہ ان دو میں سے جو چاہو لے لو، یہودیوں نے اپنی عادت کے مطابق ان کو بھی رشوت دینی چاہی، آپس میں چندہ کرکے اپنی عورتوں کے کچھ زیورات اکٹھے کیے اور کہا کہ یہ قبول کرو، اور اس کے بدلہ تقسیم میں ہمارا حصہ بڑھادو، یہ سن کر حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اے یہودیو! خدا کی قسم تم خدا کی ساری مخلوق میں مجھے مبغوض ہو، لیکن یہ مجھے تم پر ظلم کرنے پر آمادہ نہیں کرسکتا اور جو تم نے رشوت پیش کی ہے وہ حرام ہے، ہم (مسلمان) اس کو نہیں کھاتے۔'' یہودیوں نے ان کی تقریر سن کر کہا کہ ''یہی وہ انصاف ہے جس سے آسمان وزمین قائم ہیں۔'' (موطا امام مالک، کتاب المساقاۃ)

عاملین زکوٰۃ کا ہدیہ یا نذرانہ قبول کرنا:

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمال کو رعایا سے ہدیہ اور تحفہ قبول کرنے کی ممانعت فرمائی ہے (ابوداؤد، کتاب الاقضیہ)، ایک دفعہ ایک عامل نے آکر کہا کہ یہ صدقہ کا مال ہے اور یہ مجھے ہدیہ میں ملا ہے، یہ سن کر آں حضرت ﷺ نے منبر پر کھڑے ہوکر تقریر کی، حمد وثنا کے بعد فرمایا:

''عامل کا کیا حال ہے کہ ہم اس کو بھیجتے ہیں تو آکر کہتا ہے کہ یہ تمہارا ہے اور یہ میرا ہے، تو اپنے باپ یا ماں کے گھر میں بیٹھ کر نہیں دیکھتا کہ اس کو تحفے ملتے ہیں یا نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، وہ اس میں سے جو لے جائے گا وہ قیامت میں اپنی گردن پر لاد کر لائے گا، اونٹ، گائے، بکری جو ہو، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر تین بار فرمایا: ''خداوند! میں نے پہنچادیا۔'' (صحیح بخاری، باب ہدایا العمال)

اس حدیث میں غور کریں اور موجودہ دور کے عمال (یعنی مدرسہ اور ملی تنظیموں کے سفراء) پر نظر ڈالیں کہ جب وہ رمضان میں سفر سے واپس اپنے گھروں کولوٹتے ہیں تو ان کے پاس ہدایا وتحائف کی کتنی بڑی تعداد ہوتی ہے بالخصوص مہتمم، نظماء اور سکریٹری حضرات، پھر فیصلہ کریں کہ ان کا یہ ہدایا اور تحائف قبول کرنا مذکورہ حدیث کی روشنی میں کیسا ہے؟

رشوت کی برائی قرآن میں:

رشوت کی ممانعت میں قرآن کریم کی ایک اور آیت صریح طور پر دلالت کرتی ہے:

وَلاَ تَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَا إِلَىٰ الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوْا فَرِيْقًا مِنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ :(البقرة:۱۸۸)

ترجمہ: اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق اور نہ پہونچاؤ ان کو حاکموں تک کہ کھا جاؤ کوئی حصہ لوگوں کے مال میں سے ظلم کر کے (ناحق) اور تم کو معلوم ہے۔

علامہ ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ آیت ایسے شخص کے بارے میں ہے جس کے پاس کسی کا حق ہو؛ لیکن حق والے کے پاس ثبوت نہ ہو، اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر وہ عدالت یا حاکم مجاز سے اپنے حق میں فیصلہ کروالے اور اس طرح دوسرے کا حق غصب کرلے۔ یہ ظلم ہے اور حرام ہے۔ عدالت کا فیصلہ ظلم اور حرام کو جائز اور حلال نہیں کرسکتا۔ یہ ظالم عنداللہ مجرم ہوگا۔ (ابن کثیر)

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ آیت مذکورہ کی تفسیر میں حلال وحرام کے اسباب کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''شریعت اسلام میں جتنے معاملات باطل یا فاسد اور گناہ کہلاتے ہیں ان سب کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ ان میں وجوہِ مذکورہ میں کسی وجہ سے خلل ہوتا ہے، کہیں دھوکہ فریب ہوتا ہے، کہیں نامعلوم چیز یا نامعلوم عمل کا معاوضہ ہوتا ہے، کہیں کسی کا حق غصب ہوتا ہے، کہیں کسی کو نقصان پہونچا کر نفع حاصل کیا جاتا ہے، کہیں حقوق عامہ میں ناجائز تصرف ہوتا ہے، سود، قمار وغیرہ کو حرام قرار دینے کی اہم وجہ یہ ہے کہ وہ حقوق عامہ کے لیے مضر ہیں، ان کے نتیجہ میں چند افراد پلتے بڑھتے ہیں، اور پوری ملت مفلس ہوتی ہے، ایسے معاملات فریقین کی رضامندی سے بھی اس لیے حلال نہیں کہ وہ پوری امت کے خلاف ایک جرم ہے، آیت مذکورہ ان تمام ناجائز صورتوں پر حاوی ہے۔'' (معارف القرآن:۱/۴۵۹)

یہ آیت اپنے ترجمہ کے لحاظ سے رشوت کی ممانعت میں صاف وصریح ہے؛ کیوں کہ رشوت

بھی ایک ایسا عمل ہے جس کا اثر حقوق عامہ پر براہ راست پڑتا ہے، اور اس کی وجہ سے حقدار کا حق مارا جاتا ہے۔

موجودہ دور میں رشوت کا اطلاق کن چیزوں پر ہوگا؟

اب یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ دور میں کن طریقوں کو رشوت کہیں گے، تو اس کا سیدھا اور آسان جواب یہ ہے کہ مذکورہ بالا احادیث اور قرآنی آیتوں کی روشنی میں ہر وہ لین دین جو شریعت کے خلاف ہو، اور کسی کا حق مارنے کے لیے ہو یا اسی طرح غیر شرعی افعال کو انجام دینے کے لیے کچھ لیا یا دیا جارہا ہو وہ سب رشوت کے دائرہ میں آئیں گے۔

مثلاً: اس وقت ذرائع ابلاغ سب سے مؤثر اور طاقتور ذریعہ ہے اپنی بات لوگوں تک پہونچانے اور اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کا۔ تو ہر وہ شخص جو غیر شرعی طور پر اپنی بات اخبار میں شائع کرانے کے لیے یا اپنے کسی مدمقابل کو نیچا دکھانے کے لیے کوئی خبر اخبار میں شائع کراتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس طرح کی خبریں جو شخصی ہوتی ہیں اخبار والے بھی بغیر کچھ لیے دیے شائع نہیں کرتے تو یہ دینا اور اخبار والے کا لینا دونوں شرعاً بھی حرام ہیں اور صحافتی وقانونی نقطۂ نظر سے بھی حرام ہے۔ یہ تو ایک چھوٹی سی مثال تھی، آج کی دنیا میں قدم قدم پر رشوت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور اس کا چلن سب سے زیادہ سرکاری دفاتر اور محکموں میں دیکھنے کو ملتا ہے اور یہ جگہیں ایسی ہیں جہاں ایک نیک اور دین دار شخص کو بھی اپنا حق حاصل کرنے کے لیے رشوت کا سہارا لینا پڑتا ہے؛ کیوں کہ اگر وہ رشوت نہیں دیتے ہیں تو وہ اپنے حق سے محروم رہ جائیں گے، ایسے معاملات میں جہاں اپنا حق حاصل کرنے کے لیے بہ جبر واکراہ رشوت دینی پڑتی ہے، اسے تو فقہاء نے کسی حدتک جائز قرار دیا ہے؛ لیکن رشوت لینا ہر حال میں حرام اور ناجائز ہے۔

جان یا مال پر خوف کی وجہ سے رشوت دینے کی گنجائش:

آخر میں رشوت دینے اور لینے سے متعلق فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ العالی کی ایک عبارت نقل کرنا چاہتا ہوں، جس میں انہوں نے علامہ ابن نجیم کے حوالہ سے رشوت لینے اور دینے کی حرمت بیان کی ہے، مزید یہ کہ رشوت دینے کی گنجائش کن صورتوں میں ہوسکتی ہے؟

''رشوت لینا جس طرح حرام ہے، اسی طرح اصولی طور پر رشوت کا دینا بھی حرام ہے، اس سلسلہ میں فقہاء کے یہاں ایک متفق علیہ اصول ہے کہ جس چیز کا لینا جائز نہیں اس کا دینا بھی

جائز نہیں۔ ”مَاحَرُمَ أَخْذُهٗ حَرُمَ إِعْطَاءُهٗ“ البتہ چوں کہ رشوت لینا کبھی بھی مجبوری نہیں بن سکتی اور رشوت دینا بعض دفعہ مجبوری بن جاتی ہے؛ اس لیے فقہاء نے ضرورت اور مجبوری کے مواقع پر رشوت دینے کی اجازت دی ہے اور اس سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل کو پیش نظر رکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بعض دفعہ شر پسند شعراء کو اس لیے کچھ دیا کرتے تھے کہ وہ بے ہودہ ہجو پر مبنی اشعار کہنے اور مسلمانوں کو بدنام کرنے سے اجتناب کریں۔

رشوت دینے کی گنجائش کب ہوگی؟ اس سلسلہ میں فقہاء نے یہ اصول متعین کیا ہے کہ اگر رشوت نہ دے تو ناحق طریقہ پر اس کو جانی یا مالی نقصان کا اندیشہ ہو یا یہ اندیشہ ہو کہ جس ذمہ دار کے پاس اس کی درخواست زیر غور ہے، وہ اس کے ساتھ انصاف سے کام نہ لے گا اور اس کے اور دوسرے امیدواروں کے درمیان مساویانہ سلوک روا نہیں رکھے گا۔

علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

”اَلرِّشْوَةُ لِخَوْفٍ عَلٰى نَفْسِهٖ أَوْ مَالِهٖ أَوْ لِيُسَوِّيَ أَمْرَهٗ عِنْدَ السُّلْطَانِ أَوْ أَمِيْرٍ“

(ردالمحتار: ۴/۳۴۰ بحوالہ جدید فقہی مسائل: ۱/۳۰۰)

جان یا مال پر خوف کی وجہ سے نیز اس لیے کہ سلطان یا امیر کے پاس معاملہ کی صحیح صورتِ حال رکھے رشوت دینے کی گنجائش ہے یہ ممنوع صورتوں سے مستثنیٰ ہے۔

اللہ ہمیں اس برائی سے محفوظ رکھے! (آمین)

❁ ❁ ❁

نماز تراویح

از: مولانا نجیب قاسمی سنبھلی
najeebqasmi@yahoo.com

نبی اکرم ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں امت مسلمہ کا اتفاق ہے کہ نمازِ تراویح فرض نہیں؛ بلکہ سنت مؤکّدہ ہے۔ البتہ ۱۴۰۰ سال سے جاری عمل کے خلاف بعض حضرات ۲۰ رکعت نمازِ تراویح کو بدعت یا خلافِ سنت قرار دینے میں ہر سال رمضان اور رمضان سے قبل اپنی صلاحیتوں کا بیشتر حصہ صرف کرتے ہیں، جس سے امت مسلمہ کے عام طبقہ میں انتشار پیدا ہوتا ہے؛ حالانکہ اگر کوئی شخص ۸ کی جگہ ۲۰ رکعت پڑھ رہا ہے تو یہ اس کے لیے بہتر ہی تو ہے؛ کیونکہ قرآن وحدیث کی روشنی میں ساری امت مسلمہ متفق ہے کہ رمضان کی راتوں میں زیادہ سے زیادہ عبادت کرنی چاہیے، نیز حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت سے امت مسلمہ جماعت کے ساتھ ۲۰ ہی رکعت تراویح پڑھتی آئی ہے، حرمین (مسجد حرام اور مسجد نبوی) میں آج تک کبھی بھی ۸ رکعت تراویح نہیں پڑھی گئیں۔

اس موضوع سے متعلق احادیث کا جتنا بھی ذخیرہ موجود ہے، کسی بھی ایک صحیح، معتبر، اور غیر قابل نقد وجرح حدیث میں نبی اکرم ﷺ سے تراویح کی تعداد رکعت کا واضح ثبوت نہیں ملتا ہے، اگر چہ بعض احادیث میں جن کی سند میں یقیناً کچھ ضعف موجود ہے ۲۰ رکعت کا ذکر ملتا ہے۔

خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور حکومت میں بیس رکعت تراویح اور تین رکعت وتر جماعت کے ساتھ پڑھنے کا اہتمام ہوا، جیسا کہ محدثین، فقہاء، مؤرخین اور علماء کرام نے تسلیم کیا ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سب صحابہؓ کو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی امامت میں جمع کیا تو وہ بیس رکعت تراویح اور تین رکعت وتر پڑھاتے تھے۔ حضرت عمر فاروق ان خلفاء راشدین میں سے ہیں، جن کی بابت نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت پر عمل کرو اور اسی کو ڈاڑھوں

سے مضبوطی سے پکڑے رکھو۔ علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ڈاڑھوں کا ذکر اس لیے کیا کہ ڈاڑھوں کی گرفت مضبوط ہوتی ہے، لہٰذا حضرت عمر فاروقؓ کا یہ اقدام عینِ سنت ہے۔ (فتاوی ابن تیمیہ ج ۲ ص ۴۰۱، ج ۲۲ ص ۴۳۴)

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وفات ۵۷ یا ۵۸ ہجری میں ہوئی اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ۱۵ ہجری میں تراویح کی جماعت حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ کی امامت میں باقاعدہ شروع فرمائی، اگر بیس رکعات تراویح کا عمل بدعت ہوتا تو ۴۲ سال کے طویل عرصہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا آٹھ رکعت والی حدیث کو بیس رکعت پڑھنے والوں کے خلاف پیش کرنا ثابت ہوتا؛ حالانکہ ایسا نہیں ہوا، بلکہ سعودی عرب کے نامور عالم، مسجد نبوی کے مشہور مدرس اور مدینہ منورہ کے (سابق) قاضی الشیخ عطیہ محمد سالمؒ (متوفی ۱۹۹۹) نے نماز تراویح کی چودہ سو سالہ تاریخ پر عربی زبان میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس میں ثابت کیا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت سے آج تک حرمین (مسجد حرام اور مسجد نبوی) میں کبھی بھی ۲۰ سے کم تراویح نہیں پڑھی گئیں۔

تراویح کے معنی:

بخاری شریف کی مشہور و معروف شرح لکھنے والے حافظ ابن حجر العسقلانیؒ نے تحریر کیا ہے کہ تراویح، ترویحہ کی جمع ہے اور ترویحہ کے معنی: ایک دفعہ آرام کرنا ہے، جیسے تسلیمہ کے معنی ایک دفعہ سلام پھیرنا۔ رمضان المبارک کی راتوں میں نمازِ عشاء کے بعد باجماعت نماز کو تراویح کہا جاتا ہے، کیونکہ صحابۂ کرام کا اتفاق اس امر پر ہو گیا کہ ہر دو سلاموں (یعنی چار رکعت) کے بعد کچھ دیر آرام فرماتے تھے۔ (فتح الباری شرح صحیح البخاری، کتاب صلاۃ التراویح)

نماز تراویح کی فضیلت:

❁ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص رمضان (کی راتوں) میں ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے (عبادت کے لیے) کھڑا ہو، اس کے پچھلے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ (بخاری و مسلم) ثواب کی امید رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ شہرت اور دکھاوے کے لیے نہیں؛ بلکہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے عبادت کی جائے۔

نماز تراویح کی تعدادِ رکعت:

تراویح کی تعدادِ رکعت کے سلسلہ میں علماء کرام کے درمیان اختلاف ہے۔ تراویح پڑھنے

کی اگرچہ بہت فضیلت احادیث میں وارد ہوئی ہے؛ لیکن فرض نہ ہونے کی وجہ سے تراویح کی تعدادِ رکعت میں یقیناً گنجائش ہے۔ جمہور محدثین اور فقہاء کی رائے ہے کہ تراویح ۲۰ رکعت پڑھنی چاہئیں۔ تراویح کی تعدادِ رکعت میں علماء کرام کے درمیان اختلاف کی اصل بنیاد یہ ہے کہ تراویح اور تہجد ایک نماز ہے یا دو الگ الگ نمازیں۔ جمہور محدثین، فقہائے کرام نے اِن دونوں نمازوں کو الگ الگ نماز قرار دیا ہے، اُن کے نقطۂ نظر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کا تعلق تہجد کی نماز سے ہے، جس میں انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ رمضان اور رمضان کے علاوہ گیارہ رکعت سے زائد نماز نہیں پڑھتے تھے۔ جس کے انہوں نے مختلف دلائل دیے ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:

(۱) امام بخاریؒ نے اپنی مشہور کتاب (بخاری) میں نمازِ تہجد کا ذکر (**کتاب التھجد**) میں؛ جبکہ نماز تراویح کو (**کتاب صلاۃ التراویح**) میں ذکر کیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا کہ دونوں نمازیں الگ الگ ہیں، جیسا کہ جمہور علماء اور ائمۂ اربعہ نے فرمایا ہے، اگر دونوں ایک ہی نماز ہوتی تو امام بخاریؒ کو دو الگ الگ باب باندھنے کی کیوں ضرورت محسوس ہوتی۔ حضرت عائشہؓ والی حدیث کتاب التہجد میں ذکر فرما کر امام بخاریؒ نے ثابت کر دیا کہ اس حدیث کا تعلق تہجد کی نماز سے ہے۔

(۲) تراویح صرف رمضان میں پڑھی جاتی ہے، اور اِس حدیث میں ایسی نماز کا ذکر ہے جو رمضان کے علاوہ بھی پڑھی جاتی ہے۔

(۳) اگر حضرت عائشہؓ کے فرمان کا تعلق تراویح کی نماز سے ہے تو حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں جب باضابطہ جماعت کے ساتھ ۲۰ رکعت تراویح کا اہتمام ہوا تو کسی بھی صحابی نے اِس پر کوئی تنقید کیوں نہیں کی؟ (دنیا کی کسی کتاب میں، کسی زبان میں بھی، کسی ایک صحابی کا حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں ۲۰ رکعت تراویح کے شروع ہونے پر کوئی اعتراض مذکور نہیں ہے) اگر ایسی واضح حدیث تراویح کی تعداد کے متعلق ہوتی تو حضرت عمر فاروقؓ اور صحابۂ کرامؓ کو کیسے ہمت ہوتی کہ وہ ۸ رکعت تراویح کی جگہ ۲۰ رکعت تراویح شروع کر دیتے۔ صحابۂ کرامؓ تو ایک ذرا سی چیز میں بھی آپ ﷺ کی تعلیمات کی مخالفت برداشت نہیں کرتے تھے۔ اور نبی اکرم ﷺ کی سنتوں پر عمل کرنے کا جذبہ یقیناً صحابۂ کرامؓ میں ہم سے بہت زیادہ تھا؛ بلکہ ہم (یعنی آج کے مسلمان) صحابہ کی سنتوں پر عمل کرنے کے جذبہ سے اپنا کوئی مقارنہ بھی نہیں کر سکتے۔ نیز نبی اکرم ﷺ کا

فرمان ہے: ہم خلفاء راشدین کی سنتوں کو بھی مضبوطی سے پکڑلیں۔ (ابن ماجہ)

(۴) اگر اس حدیث کا تعلق واقعی تراویح کی نماز سے ہے (اور تہجد و تراویح ایک نماز ہے) تو رمضان کے آخری عشرہ میں نمازِ تراویح پڑھنے کے بعد تہجد کی نماز کیوں پڑھی جاتی ہے؟

(۵) اس حدیث کا تعلق تہجد کی نماز سے ہے، جیسا کہ محدثین نے اس حدیث کو تہجد کے باب میں نقل کیا ہے، نہ کہ تراویح کے باب میں۔ (ملاحظہ ہو: مسلم ج۱ ص۱۵۴، ابوداؤد ج۱ ص۱۹۶، ترمذی ج۱ ص۵۸، نسائی ج۱ ص۱۵۴، مؤطا امام مالک ص۴۲)۔

علامہ شمس الدین کرمانیؒ (شارح بخاری) تحریر فرماتے ہیں کہ یہ حدیث تہجد کے بارے میں ہے اور حضرت ابوسلمہؓ کا مذکورہ بالا سوال اور حضرت عائشہؓ کا جواب تہجد کے متعلق تھا۔ (الکوکب الدراری شرح صحیح البخاری ج۱ ص۱۵۵۔۱۵۶)

حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ گیارہ رکعت (وتر کے ساتھ) پڑھتے تھے وہ تہجد کی نماز تھی۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں کہ یہ حدیث تہجد کی نماز پر محمول ہے جو رمضان اور غیر رمضان میں برابر تھی۔ (مجموعہ فتاوی عزیزی ص۱۲۵)

نمازِ تراویح نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں:

❁ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (رمضان کی) ایک رات مسجد میں نماز تراویح پڑھی۔ لوگوں نے آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی۔ پھر دوسری رات کی نماز میں شرکاء زیادہ ہوگئے، تیسری یا چوتھی رات آپ ﷺ نماز تراویح کے لیے مسجد میں تشریف نہ لائے اور صبح کو فرمایا کہ میں نے تمہارا شوق دیکھ لیا اور میں اس ڈر سے نہیں آیا کہ کہیں یہ نماز تم پر رمضان میں فرض نہ کردی جائے۔ (مسلم، الترغیب فی صلاۃ التراویح)..... ان دو یا تین رات کی تراویح کی رکعت کے متعلق کوئی تعداد احادیثِ صحیحہ میں مذکور نہیں ہے۔

❁ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ قیام رمضان کی ترغیب تو دیتے تھے؛ لیکن وجوب کا حکم نہیں دیتے۔ آپ ﷺ فرماتے کہ جو شخص رمضان کی راتوں میں نماز (تراویح) پڑھے اور وہ ایمان کے دوسرے تقاضوں کو بھی پورا کرے اور ثواب کی نیت سے یہ عمل کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے سابقہ گناہ معاف فرمادیں گے۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات تک یہی عمل رہا، دورِ صدیقی اور ابتداء عہد فاروقی میں بھی یہی عمل رہا۔ (مسلم۔ الترغیب فی صلاۃ التراویح)

صحیح مسلم کی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ کی حیات میں، حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے دورِ خلافت اور حضرت عمر فاروق ؓ کے ابتدائی دور خلافت میں نماز تراویح جماعت سے پڑھنے کا کوئی اہتمام نہیں تھا، صرف ترغیب دی جاتی تھی؛ البتہ حضرت عمر فاروق ؓ کے عہد خلافت میں یقیناً تبدیلی ہوئی ہے، اس تبدیلی کی وضاحت مضمون میں محدثین اور فقہائے کرام کی تحریروں کی روشنی میں آرہی ہے۔

❁ حضرت عائشہ ؓ کی روایت (جس میں انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ رمضان اور رمضان کے علاوہ گیارہ رکعت سے زائد نماز نہیں پڑھتے تھے) میں لفظِ تراویح کا ذکر نہیں ہے۔ لہٰذا اس حدیث کا تعلق تہجد کی نماز سے ہے؛ کیونکہ محدثین نے اس حدیث کو تہجد کے باب میں نقل کیا ہے، نہ کہ تراویح کے باب میں۔ (ملاحظہ ہو: مسلم ج۱ ص۱۵۴، ابوداؤد ج۱ ص۱۹۶، ترمذی ج۱ ص۵۸، نسائی ج۱ ص۱۵۴، مؤطا امام مالک ص۴۲) اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان محدثین کے نزدیک یہ حدیث تہجد کی نماز سے متعلق ہے نہ کہ تراویح سے۔

امام محمد بن نصر مروزیؒ نے اپنے مشہور کتاب (قیام اللیل، ص۱۹۱ و۹۲) میں قیام رمضان کا باب باندھ کر بہت سی حدیثیں اور روایتیں نقل فرمائی ہیں؛ مگر مذکورہ بالا حدیثِ عائشہ نقل نہیں فرمائی؛ اس لیے کہ ان کے نزدیک یہ حدیث تراویح کے متعلق ہے ہی نہیں۔

علامہ ابن قیمؒ نے اپنی مشہور ومعروف کتاب (زادالمعاد ص۸۶) میں قیام اللیل (تہجد) کے بیان میں یہ حدیث نقل فرمائی ہے۔ علاوہ ازیں اس روایت کے متعلق حافظ حدیث امام قرطبیؒ کا یہ قول بھی نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے کہ بہت سے اہل علم حضرات اس روایت کو مضطرب مانتے ہیں۔ (عینی شرح بخاری ج۷ ص۱۸۷)

نمازِ تراویح خلفاء راشدین کے زمانے میں:

❁ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے عہد میں کتنی تراویح پڑھی جاتی تھیں، احادیث صحیحہ میں صحابۂ کرام ؓ کا کوئی واضح عمل مذکور نہیں ہے۔ گویا اس دور کا معمول حسب سابق رہا اور لوگ اپنے طور پر نماز تراویح پڑھتے رہے، غرضے کہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے عہدِ خلافت (یعنی دور رمضان) میں نماز تراویح باقاعدہ جماعت کے ساتھ ایک مرتبہ بھی ادا نہیں ہوئی۔

❁ حضرت عمر فاروق ؓ نے جب اپنے عہد خلافت میں لوگوں کو دیکھا کہ تنہا تنہا تراویح کی نماز پڑھ رہے ہیں تو حضرت عمر فاروق ؓ نے سب صحابہ ؓ کو حضرت ابی بن کعب ؓ کی امامت میں جمع

کیا، اورعشاء کے فرائض کے بعد وتروں سے پہلے باجماعت ۲۰ رکعت نماز تراویح میں قرآن کریم مکمل کرنے کا باضابطہ سلسلہ شروع کیا۔

❁ حضرت عبدالرحمٰن قاریؒ فرماتے ہیں کہ میں حضرت عمر فاروقؓ کے ہمراہ رمضان میں مسجد میں گیا تو دیکھا کہ لوگ مختلف گروپوں میں علیحدہ علیحدہ نماز تراویح پڑھ رہے ہیں، کوئی اکیلا پڑھ رہا ہے اور کسی کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی شریک ہیں، اس پر حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ واللہ! میرا خیال ہے کہ اگر ان سب کو ایک امام کی اقتداء میں جمع کردیا جائے تو بہت اچھا ہے اور سب کو حضرت ابی بن کعبؓ کی اقتداء میں جمع کردیا۔۔۔۔ حضرت عبدالرحمٰن فرماتے ہیں کہ پھر جب ہم دوسری رات نکلے اور دیکھا کہ سب لوگ ایک ہی امام کی اقتداء میں نماز تراویح ادا کررہے ہیں تو حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ یہ بڑا اچھا طریقہ ہے اور مزید فرمایا کہ ابھی تم رات کے جس آخری حصہ (تہجد) میں سوجاتے ہو، وہ اس (تراویح) سے بھی بہتر ہے جس کو تم نماز میں کھڑے ہوکر گزارتے ہو۔ (مؤطا امام مالکؒ، باب ماجاء فی قیام رمضان)

❁ حضرت یزید بن رومانؒ فرماتے ہیں کہ لوگ (صحابۂ کرامؓ) حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں ۲۳ رکعت (۲۰ تراویح اور ۳ وتر) ادا فرماتے تھے۔ (مؤطا امام مالکؒ، باب ماجاء فی قیام رمضان، ص ۹۸)

❁ علامہ بیہقیؒ نے کتاب المعرفہ میں نقل کیا ہے کہ حضرت سائب بن یزیدؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ کے دور حکومت میں ہم ۲۰ رکعت تراویح اور وتر پڑھا کرتے تھے۔ امام زیلعیؒ نے اس حدیث کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ (نصب الرایۃ ج ۲ ص ۱۵۴)

❁ حضرت ابی بن کعبؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے انہیں حکم دیا کہ رمضان کی راتوں میں نماز پڑھائیں؛ چنانچہ فرمایا کہ لوگ سارا دن روزہ رکھتے ہیں اور قرارت اچھی طرح نہیں کرسکتے۔ اگر آپ رات کو انہیں (نماز میں) قرآن سنائیں تو بہت اچھا ہوگا۔ پس حضرت ابی بن کعبؓ نے انہیں ۲۰ رکعتیں پڑھائیں۔ (مسند احمد بن منیع بحوالہ اتحاف الخیرۃ المہرۃ للبوصیری علی المطالب العالیہ ج ۲ ص ۴۲۴)

❁ موطا امام مالک میں یزید بن خصیفہؒ کے طریق سے سائب بن یزیدؓ کی روایت ہے کہ عہد فاروقی میں بیس رکعت تراویح تھیں۔ (فتح الباری لابن حجر ج ۴ ص ۳۲۱، نیل الاوطار للشوکانی ج ۲ ص ۵۱۴)

❁ حضرت محمد بن کعب القرظیؒ (جو جلیل القدر تابعی ہیں) فرماتے ہیں کہ لوگ حضرت عمرؓ کے دور میں بیس رکعت تراویح پڑھتے تھے۔ (قیام اللیل للمروزی ص ۱۵۷)

❁ حضرت یحییٰ بن سعیدؒ کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ نے ایک آدمی کو حکم دیا کہ لوگوں کو بیس رکعت تراویح پڑھائے۔ (مصنف بن ابی شیبہ ج ۲ ص ۲۸۵)

❁ حضرت حسنؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے لوگوں کو حضرت ابی بن کعبؓ کی امامت پر جمع فرمایا۔ وہ لوگوں کو بیس رکعت نماز تراویح پڑھاتے تھے۔ (ابوداؤد ج ۱ ص ۲۱۱، باب القنوت والوتر)

❁ حضرت سائب بن یزیدؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں تین رکعت (وتر) اور بیس رکعت (تراویح) پڑھی جاتی تھیں۔ (مصنف عبدالرزاق ج ۴ ص ۲۰۱، حدیث نمبر ۷۷۶۳)

❁ حضرت سائب بن یزیدؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں ہم ۲۰ رکعت تراویح پڑھا کرتے تھے، اور قاری صاحب سو سو آیات والی سورتیں پڑھتے تھے اور لمبے قیام کی وجہ سے حضرت عثمان غنیؓ کے دور میں لاٹھیوں کا سہارا لیتے تھے۔ (السنن الکبری للبیہقی ج ۲ ص ۴۹۶)

❁ حضرت ابوالحسناءؒ سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو رمضان میں بیس رکعت تراویح پڑھائے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۲۸۵)

❁ حضرت ابوعبدالرحمٰن السلمیؒ سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے رمضان میں قاریوں کو بلایا۔ پھر ان میں سے ایک قاری کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو بیس رکعت تراویح پڑھائے اور حضرت علیؓ خود انہیں وتر پڑھاتے تھے۔ (السنن الکبری للبیہقی ج ۲ ص ۴۹۶)

نماز تراویح سے متعلق صحابہ وتابعین کا عمل:

❁ حضرت اعمشؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا معمول بھی بیس رکعت تراویح اور تین رکعت وتر پڑھنے کا تھا۔ (قیام اللیل للمروزی ص ۱۵۷)

❁ حضرت حسن بصریؒ حضرت عبدالعزیز بن رفیعؒ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابی بن کعبؓ رمضان میں لوگوں کو بیس رکعت تراویح اور تین رکعت وتر پڑھاتے تھے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۲۸۵)

❁ حضرت عطا بن ابی رباحؒ (جلیل القدر تابعی، تقریباً ۲۰۰ صحابۂ کرامؓ کی زیارت کی ہے)

فرماتے ہیں کہ میں نے لوگوں (صحابہ) کو بیس رکعت تراویح اور تین رکعت وتر پڑھتے پایا ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۲۸۵)

❁ حضرت ابراہیم نخعیؒ (جلیل القدر تابعی، کوفہ کے مشہور و معروف مفتی) فرماتے ہیں کہ لوگ رمضان میں پانچ ترویحہ سے بیس رکعت پڑھتے تھے۔ (کتاب الآثار بروایت ابی یوسف ص ۴۱)

❁ حضرت شیتر بن شکلؒ (نامور تابعی، حضرت علیؓ کے شاگرد) لوگوں کو رمضان میں بیس رکعت تراویح اور تین رکعت وتر پڑھاتے تھے۔ (السنن الکبری للبیہقی ج ۲ ص ۴۹۶)

❁ حضرت ابوالبختریؒ (اہل کوفہ میں اپنا علمی مقام رکھتے تھے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابوسعیدؓ کے شاگرد)۔ آپ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ رمضان میں پانچ ترویحہ سے بیس رکعت تراویح اور تین رکعت وتر پڑھاتے تھے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۲۸۵)

❁ حضرت سوید بن غفلہؒ (حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ صحابہؓ کی زیارت کی ہے)۔ آپ کے بارے میں ابوالخصیبؒ فرماتے ہیں کہ حضرت سوید بن غفلہؒ رمضان میں پانچ ترویحہ سے بیس رکعت تراویح پڑھاتے تھے۔ (السنن الکبری للبیہقی ج ۲ ص ۴۹۶)

❁ حضرت ابن ابی ملیکہؒ (جلیل القدر تابعی، تقریباً تیس صحابۂ کرامؓ کی زیارت سے مشرف ہوئے) آپ کے متعلق حضرت نافع بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن ابی ملیکہؒ ہمیں رمضان میں بیس رکعت تراویح پڑھاتے تھے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۲۸۵)

نماز تراویح سے متعلق اکابرین امت کے اقوال:

امام ابو حنیفہؒ: علامہ ابن رشدؒ لکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کے ہاں قیام رمضان بیس رکعت ہے۔ (بدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۲۱۴)

امام فخرالدین قاضی خانؒ لکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ رمضان میں ہر رات بیس یعنی پانچ ترویحہ وتر کے علاوہ پڑھنا سنت ہے۔ (فتاوی قاضی خان ج ۱ ص ۱۱۲)

علامہ علاء الدین کاسانی حنفیؒ لکھتے ہیں کہ جمہور علماء کا صحیح قول یہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابی بن کعبؓ کی امامت میں صحابۂ کرامؓ کو تراویح پڑھانے پر جمع فرمایا تو انہوں نے بیس رکعت تراویح پڑھائی اور صحابہؓ کی طرف سے اجماع تھا۔ (بدائع الصنائع)

امام مالکؒ: امام مالکؒ کے مشہور قول کے مطابق تراویح کی ۳۶ رکعت ہیں؛ جبکہ ان کے ایک قول کے مطابق بیس رکعت سنت ہیں۔ علامہ ابن رشد قرطبی مالکیؒ فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ نے ایک قول میں بیس رکعت تراویح کو پسند فرمایا ہے۔ (بدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۲۱۴)

مسجد حرام میں تراویح کی ہر چار رکعت کے بعد ترویحہ کے طور پر مکہ کے لوگ ایک طواف کرلیا کرتے تھے، جس پر مدینہ منورہ والوں نے ہر ترویحہ پر چار رکعت نفل پڑھنی شروع کردیں تو اس طرح امام مالکؒ کی ایک رائے میں ۳۶ رکعت (۲۰ رکعت تراویح اور ۱۶ رکعت نفل) ہوگئیں۔

امام شافعیؒ: امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مجھے بیس رکعت تراویح پسند ہیں، مکہ مکرمہ میں بیس رکعت ہی پڑھتے ہیں۔ (قیام اللیل ص ۱۵۹) ایک دوسرے مقام پر امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شہر مکہ مکرمہ میں لوگوں کو بیس رکعت نماز تراویح پڑھتے پایا ہے۔ (ترمذی ج ۱ ص ۱۶۶) علامہ نووی شافعیؒ لکھتے ہیں کہ تراویح کی رکعت کے متعلق ہمارا (شوافع) مسلک وتر کے علاوہ دس سلاموں کے ساتھ بیس رکعت کا ہے، اور بیس رکعت پانچ ترویحہ ہیں اور ایک ترویحہ چار رکعت کا دو سلاموں کے ساتھ، یہی امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب اور امام احمد بن حنبلؒ اور امام داؤد ظاہری کا مسلک ہے اور قاضی عیاضؒ نے بیس رکعت تراویح کو جمہور علماء سے نقل کیا ہے۔ (المجموع)

امام احمد بن حنبلؒ: فقہ حنبلی کے ممتاز ترجمان علامہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں: امام ابوعبداللہ (احمد بن حنبلؒ) کا پسندیدہ قول بیس رکعت کا ہے اور حضرت سفیان ثوریؒ بھی یہی کہتے ہیں اور ان کی دلیل یہ ہے کہ جب حضرت عمر فاروقؓ نے صحابۂ کرامؓ کو حضرت ابی بن کعبؓ کی اقتداء میں جمع کیا تو وہ بیس رکعت پڑھتے تھے، نیز حضرت امام احمد ابن حنبلؒ کا استدلال حضرت یزید وعلیؓ کی روایات سے ہے۔ ابن قدامہؒ کہتے ہیں کہ یہ بمنزلہ اجماع کے ہے۔ نیز فرماتے ہیں کہ جس چیز پر حضورِ اکرم ﷺ کے صحابہؓ عمل پیرا رہے ہوں، وہی اتباع کے لائق ہے۔ (المغنی لابن قدامہ ج ۲ ص ۱۳۹، صلاۃ التراویح)

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ جمہور اہل علم کا مسلک وہی ہے جو حضرت علیؓ و حضرت عمرؓ اور دیگر صحابۂ کرامؓ سے منقول ہے کہ تراویح میں بیس رکعت ہیں، حضرت سفیان ثوریؒ، ابن مبارکؒ اور امام شافعیؒ کا بھی یہی مسلک ہے اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اہل مکہ کو بیس رکعت پڑھتے دیکھا۔ (ترمذی، ما جاء فی قیام شہر رمضان) امام ترمذیؒ نے اس موقع پر تحریر کیا ہے کہ بعض حضرات مدینہ منورہ میں ۴۱ رکعت تراویح پڑھا کرتے تھے۔ لیکن امام ترمذیؒ نے اہل مکہ یا اہل مدینہ میں

سے ۸ تراویح پر کسی کا عمل نقل نہیں کیا۔

مسلم شریف کی سب سے مشہور و معروف شرح لکھنے والے علامہ نوویؒ جو ریاض الصالحین کے مصنف بھی ہیں فرماتے ہیں کہ قیام رمضان سے مراد تراویح ہے اور تمام علماء متفق ہیں کہ یہ نماز اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے؛ البتہ اس میں کچھ اختلاف ہے کہ گھر میں اکیلا پڑھنا بہتر ہے یا مسجد میں با جماعت؟ تو امام شافعیؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ بعض مالکی اور دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ با جماعت پڑھنا بہتر ہے؛ چونکہ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرات صحابۂ کرامؓ نے ایسا ہی کیا اور اس پر مسلسل عمل جاری ہے حتی کہ یہ مسلمانوں کی ظاہری علامات میں سے ایک علامت ہے۔ (شرح مسلم للنووی، ملخص: الترغیب فی قیام رمضان)

نیز علامہ نوویؒ فرماتے ہے کہ جان لو کہ نماز تراویح کے سنت ہونے پر تمام علماء کا اجماع ہے اور یہ بیس رکعت ہیں، جن میں ہر دو رکعت کے بعد سلام پھیرا جاتا ہے۔ (الاذکار ص ۸۳)

علامہ عینیؒ (بخاری شریف کی شرح لکھنے والے) تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ کے زمانہ میں تراویح کی بیس رکعت پڑھی جاتی تھیں۔ (عینی ج ۷ ص ۱۷۸)

شیخ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ تراویح بیس رکعتیں ہیں جن کا طریقہ معروف و مشہور ہے اور یہ سنت مؤکدہ ہے۔ (احیاء العلوم ج ۱ ص ۱۳۲)

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ تراویح نبی اکرم ﷺ کی سنت مبارکہ ہے اور یہ بیس رکعت ہیں۔ (غنیۃ الطالبین ص ۲۶۷، ۲۶۸)

مولانا قطب الدین خان محدث دہلویؒ فرماتے ہیں: اجماع ہوا صحابہؓ کا اس پر کہ تراویح کی بیس رکعت ہیں۔ (مظاہر حق ج ۱ ص ۴۳۶)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی سب سے مشہور و معروف کتاب (حجۃ اللہ البالغہ) میں تحریر کیا ہے کہ صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ کے زمانہ میں تراویح کی بیس رکعت مقرر ہوئی تھیں؛ چنانچہ فرماتے ہیں کہ صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ نے قیام رمضان میں تین چیزیں زیادہ کی ہیں:

(۱) مسجدوں میں جمع ہونا؛ کیونکہ اس سے عوام و خواص پر آسانی ہوتی ہے۔

(۲) اس کو شروع رات میں ادا کرنا؛ جبکہ اخیر رات میں پڑھنا زیادہ افضل ہے جیسا کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اس طرف اشارہ فرمایا۔

(۳) تراویح کی تعداد بیس رکعت۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۶۷)

مشہور غیر مقلد عالم نواب صدیق حسن خان مرحوم بھوپالیؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں جو طریقہ بیس رکعت پڑھانے کا ہوا، اس کو علماء نے اجماع کے مثل شمار کیا ہے۔ (عون الباری ج ۴ ص ۳۱۷)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کی مکمل عبارت اور اس کا صحیح مفہوم:

عَنْ اَبِی سَلْمیٰ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ اَنَّہٗ اَخْبَرَہٗ اَنَّہٗ سَأَلَ عَائِشَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا کَیْفَ کَانَتْ صَلَاۃُ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ فِیْ رَمَضَانَ فَقَالَتْ مَا کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یَزِیْدُ فِیْ رَمَضَانَ وَلَا فِیْ غَیْرِہٖ عَلَی اِحْدٰی عَشْرَۃَ رَکْعَۃً یُصَلِّیْ اَرْبَعاً فَلَا تَسْئَلْ عَنْ حُسْنِھِنَّ وَطُوْلِھِنَّ ثُمَّ یُصَلِّیْ اَرْبَعاً فَلَا تَسْئَلْ عَنْ حُسْنِھِنَّ وَطُوْلِھِنَّ ثُمَّ یُصَلِّیْ ثَلَاثاً. قَالَتْ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَتَنَامُ قَبْلَ اَنْ تُوتِرَ فَقَالَ: یَا عَائِشَۃُ! اِنَّ عَیْنَیَّ تَنَامَانِ وَلَا یَنَامُ قَلْبِیْ..

(بخاری، کتاب التھجد)

حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رسول اکرم ﷺ کی رمضان میں نماز کی کیا کیفیت ہوا کرتی تھی؟ تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اللہ کے رسول ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھا کرتے تھے۔ آپ ﷺ پہلے چار رکعت ادا کرتے تھے اور ان کی خوبی اور ان کی لمبائی کے بارے میں مت پوچھو (کہ وہ کتنی خوب اور کتنی لمبی ہوا کرتی تھیں) پھر آپ چار رکعت اسی طرح پڑھا کرتے تھے۔ پھر تین رکعت وتر پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ آپ وتر پڑھنے سے پہلے سو جاتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے عائشہؓ! میری آنکھیں سوتی ہیں، میرا دل نہیں سوتا۔

﴿وضاحت﴾: یاد رکھیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کا اصل تعلق تہجد کی نماز سے ہے اور تہجد اور تراویح دو الگ الگ نمازیں ہیں، یہی جمہور علماء کا مسلک ہے۔

اس حدیث میں حضور اکرم ﷺ کی نماز کی کیفیت بیان کی گئی کہ آپ ﷺ پہلے خوب لمبے قیام و رکوع و سجدہ والی چار رکعت ادا کرتے تھے پھر خوب لمبے قیام و رکوع و سجدہ والی چار رکعت ادا کرتے تھے، اور پھر تین رکعت وتر پڑھا کرتے تھے۔ حدیث کے الفاظ سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سوال اور جواب کا اصل مقصد حضور اکرم ﷺ کی نماز کی کیفیت کو بیان کرنا ہے، نہ کہ تعداد رکعت کو۔ بعض حضرات نے تہجد اور تراویح کی نماز کو ایک سمجھ کر حدیث میں وارد گیارہ میں سے

آٹھ کے لفظ کو تراویح کے لیے لے لیا؛ لیکن گیارہ رکعت پڑھنے کی کیفیت اور تین رکعت وتر کو نظر انداز کر دیا۔

اگر نمازِ تہجد اور نمازِ تراویح ایک ہی نماز ہے اور تراویح کے آٹھ رکعت ہونے کی یہی حدیث دلیل ہے، تو چاہیے کہ اس حدیث کے تمام اجزاء پر عمل کیا جائے اور اس میں بیان کردہ پوری کیفیت کے ساتھ نماز تراویح ادا کی جائے یا کم از کم اس کے مسنون ہونے کو بیان کیا جائے؛ مگر اس حدیث سے صرف آٹھ کا لفظ تو لے لیا؛ مگر آٹھ رکعت نماز کی کیفیت کو چھوڑ دیا؛ کیونکہ اس میں لمبی لمبی چار چار رکعت پڑھنے کا ذکر ہے اور تین رکعت وتر کا ذکر ہے، نیز وتر کے لیے تین کے لفظ کو چھوڑ کر صرف ایک ہی رکعت وتر کو اپنی سہولت کے لیے اختیار کر لیا۔ اس حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ آٹھ رکعت پڑھنے کے بعد سو جاتے پھر وتر پڑھتے تھے؛ حالانکہ ماہِ رمضان میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت سے سارے حضرات نماز عشاء کے ساتھ تراویح پڑھنے کے فوراً بعد وتر جماعت کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ بخاری کی اس حدیث کے صرف آٹھ کے لفظ کو لے کر باقی تمام امور کو چھوڑنا، یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث پر عمل کرنا نہیں ہوا؛ بلکہ اپنے اسلاف کے قرآن وحدیث فہمی پر قناعت کرنا ہے اور یہی تقلید ہے؛ حالانکہ بخاری میں ہی حضرت عائشہؓ کی دوسری حدیث ہے: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّي بِاللَّيْلِ ثَلَاثَ عَشَرَةَ رَكْعَةً ثُمَّ يُصَلِّي إِذَا سَمِعَ النِّدَا بِالصُّبْحِ رَكْعَتَيْنِ خَفِيفَتَيْنِ (باب ما يقرأ في ركعتي الفجر) یعنی اللہ کے رسول ﷺ تہجد کی نماز تیرہ رکعت پڑھتے تھے اور جب فجر کی اذان سنتے تو دو ہلکی رکعت ادا کرتے (یعنی فجر کی سنت)۔ غور فرمائیں کہ گیارہ رکعت والی حدیث بھی بخاری میں ہے اور تیرہ رکعت والی حدیث بھی بخاری میں اور دونوں حدیثیں حضرت عائشہؓ سے ہی مروی ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ گیارہ رکعت والی حدیث میں سے لفظ آٹھ کو تو لے لیا اور تیرہ رکعت والی حدیث کو بالکل ہی چھوڑ دیا؛ حالانکہ تیرہ رکعت والی حدیث میں ''کان'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو عربی زبان میں ماضی استمرار کے لیے ہے یعنی آپ ﷺ کا تیرہ رکعت پڑھنے کا معمول تھا۔ نمازِ تہجد اور نمازِ تراویح کو ایک کہنے والے حضرات قرآن وحدیث کی روشنی میں دونوں احادیث میں تطبیق دینے سے قاصر ہیں۔ جب پوچھا جاتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی آٹھ رکعت والی حدیث میں تو چار چار رکعت پڑھنے کا تذکرہ ہے؛ لیکن عمل دو دو رکعت پڑھنے کا ہے تو جواب میں دوسری حدیث کا حوالہ دیا جاتا ہے، جس میں نماز تہجد کو دو دو رکعت پڑھنے کا تذکرہ ہے، اور وہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی حدیث ہے

جو بخاری ہی (کتاب الوتر) میں ہے: ثُمَّ صَلّٰی رَکْعَتَیْنِ، ثُمَّ رَکْعَتَیْنِ، ثُمَّ رَکْعَتَیْنِ، ثُمَّ رَکْعَتَیْنِ، ثُمَّ رَکْعَتَیْنِ، ثُمَّ رَکْعَتَیْنِ، ثُمَّ اَوْتَرَ. حضوراکرم ﷺ نے وضووغیرہ سے فارغ ہوکر نمازِ تہجد پہلے دو رکعت ادا کی، پھر دورکعت ادا کی، پھر دورکعت ادا کی، پھر دورکعت ادا کی، پھر دورکعت ادا کی، پھر دورکعت ادا کی، پھر وتر پڑھے۔ بخاری کی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضور اکرم ﷺ نمازِ وتر کے علاوہ دو دو رکعت کرکے تہجد کی کل بارہ رکعتیں ادا فرماتے۔ آٹھ رکعت تراویح کا موقف رکھنے والے حضرات کے نزدیک تراویح اور تہجد ایک ہی نماز ہے تو ان احادیث میں تطبیق کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ غرضے کہ حضرت عائشہؓ کی پہلی حدیث سے آٹھ کا لفظ لیا اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی اس حدیث سے دو دو رکعت پڑھنے کو لیا، تو نہ تو حضرت عائشہؓ کی حدیث پر عمل ہوا اور نہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی حدیث پر عمل ہوا؛ بلکہ اپنے اسلاف کی تقلید ہوئی؛ حالانکہ یہ تینوں احادیث صحیح بخاری کی ہی ہیں۔ معلوم ہوا کہ نمازِ تراویح اور نمازِ تہجد کو ایک قرار دینا ہی غلط ہے؛ کیونکہ اس کا ثبوت دلائل شرعیہ سے نہیں دیا جاسکتا ہے۔ چاروں ائمہ میں سے کوئی بھی دونوں نمازوں کو ایک قرار دینے کا قائل نہیں ہے۔ امام بخاریؒ تو تراویح کے بعد تہجد بھی پڑھا کرتے تھے، امام بخاریؒ تراویح باجماعت پڑھا کرتے تھے اور ہر رکعت میں بیس آیتیں پڑھا کرتے تھے اور پورے رمضان میں تراویح میں صرف ایک ختم کرتے تھے، جب کہ تہجد کی نماز امام بخاریؒ تنہا پڑھا کرتے تھے اور تہجد میں ہر تین رات میں ایک قرآن کریم ختم کیا کرتے تھے۔ (امام بخاریؒ کے اس عمل کی تفصیلات پڑھنے کے لیے صحیح بخاری کی سب سے مشہور ومعروف شرح "فتح الباری" کے مقدمہ کا مطالعہ فرمائیں)۔

بس بات صحیح یہی ہے کہ نماز تراویح اور نماز تہجد دو الگ الگ نمازیں ہیں، تہجد کی نماز تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے متعین ہوئی ہے، سورۃ المزمل کی ابتدائی آیات (یَاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا.....) پڑھ لیں؛ جبکہ تراویح کا عمل حضوراکرم ﷺ کے فرمان سے مشروع ہوا ہے، جیسا کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: سَنَنْتُ لَہٗ قِیَامَہٗ (نسائی، ابن ماجہ) تراویح کا عمل میں نے مسنون قرار دیا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں جماعت کے ساتھ بیس رکعت کا باقاعدہ اہتمام کے ساتھ شروع ہونا، روز روشن کی طرح واضح ہے، جیسا کہ محدثین وعلماء کرام کے اقوال، حوالوں کے ساتھ اوپر تحریر کیے جاچکے ہیں۔ لہٰذا اس حقیقت کا انکار کرنا صرف اور صرف ہٹ دھرمی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث کا تعلق تہجد کی نماز سے ہے، جو آپ ﷺ کبھی کم کبھی زیادہ پڑھا کرتے تھے۔

ایک شبہ کا ازالہ:

بعض حضرات نے ابن خزیمہ وابن حبان میں وارد حضرت جابرؓ کی روایت سے ثابت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے رمضان میں آٹھ رکعات تراویح پڑھیں؛ حالانکہ یہ روایت اس قدر ضعیف ومنکر ہے کہ اس سے استدلال نہیں کیا جاسکتا ہے؛ کیونکہ اس میں ایک راوی عیسیٰ بن جاریہ ہے، جس کی بابت محدثین نے تحریر کیا ہے کہ اس کے پاس منکر روایات ہیں، جیسا کہ ۸ رکعت تراویح کا موقف رکھنے والے حضرات نے دوسرے مسائل میں اس طرح کے راویوں کی روایات کو تسلیم کرنے سے منع کیا ہے۔ اس نوعیت کی متعدد احادیث جمہور مسلمین کے پاس بھی موجود ہیں، جن میں مذکور ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے بیس رکعت تراویح پڑھیں: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ بیشک نبی اکرم ﷺ ماہِ رمضان میں بلا جماعت بیس رکعت اور وتر پڑھتے تھے۔ (بیہقی، ج ا ص ۴۹۶، اس حدیث کو طبرانی نے کبیر میں، ابن عدی نے مسند میں اور علامہ بغوی نے مجمع صحابہ میں ذکر کیا ہے) (زجاجۃ المصابیح)۔۔۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے امام رافعیؒ کے واسطہ سے نقل کیا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے لوگوں کو بیس رکعت دو راتیں پڑھائیں پھر تیسری رات کو لوگ جمع ہوگئے؛ مگر آپ باہر تشریف نہیں لائے۔ پھر صبح کو فرمایا کہ مجھے اندیشہ تھا کہ یہ تمہارے اوپر فرض نہ ہوجائے اور تم اس کو ادا نہ کرسکو؛ اس لیے باہر نہیں آیا۔

دوسرے شبہ کا ازالہ:

بعض حضرات نے ایک روایت کی بنیاد پر تحریر کیا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے گیارہ رکعت تراویح کا حکم دیا تھا؛ حالانکہ یہ حدیث تین طرح سے منقول ہے اور حدیث کی سند میں شدید ضعف بھی ہے۔۔۔ نیز حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں بیس رکعت تراویح پڑھی گئیں، یہ بات سورج کی روشنی کی طرح محدثین واکابر امت نے تسلیم کی ہے، جیسا کہ محدثین وعلماء کرام کے اقوال حوالوں کے ساتھ اوپر تحریر کیے جاچکے ہیں۔ لہٰذا اس حقیقت کا انکار کرنا صرف ہٹ دھرمی ہے۔ امام ترمذیؒ، امام غزالیؒ، علامہ نوویؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، علامہ ابن قدامہؒ، علامہ ابن تیمیہؒ اور مشہور غیر مقلد عالم نواب صدیق حسن خان مرحوم بھوپالیؒ نے بھی وضاحت کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ مشہور غیر مقلد عالم مفتی محمد حسین بٹالویؒ نے جب پہلی دفعہ ۱۲۸۴ھ میں باضابطہ طور پر فتوی جاری کیا کہ آٹھ رکعت تراویح سنت اور بیس رکعت بدعت ہے تو اس انوکھے فتوے کی ہر طرف سے مخالفت کی گئی۔ مشہور غیر مقلد بزرگ عالم مولانا غلام رسولؒ صاحب نے خود اس فتویٰ کی سخت

کلمات میں مذمت کی، اور اس کو سینہ زوری قرار دیا۔ (رسالہ تراویح ص ۲۸، ۵۶)

تیسرے شبہ کا ازالہ:

کچھ حضرات کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ اور صحابۂ کرامؓ کے اقوال میں اگر کوئی تضاد ہو تو صحابہ کے اقوال کو چھوڑ کر نبی اکرم ﷺ کے قول کو لیا جائے گا۔ اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔ اگر کوئی اِس میں شک بھی کرے، تو اُسے اپنے ایمان کی تجدید کرنی ہوگی؛ لیکن یہاں کوئی تضاد نہیں ہے؛ کیونکہ نبی اکرم ﷺ کے اقوال وافعال میں کہیں بھی تراویح کی کوئی تعداد مذکور نہیں ہے۔ نبیِ اکرم ﷺ کی سنتوں سے صحابۂ کرامؓ کو ہم سے زیادہ محبت تھی۔ اور دین میں نئی بات پیدا کرنے سے صحابۂ کرامؓ ہم سے زیادہ ڈرنے والے تھے۔

خصوصی توجہ:

سعودی عرب کے نامور عالم، مسجد نبوی کے مشہور مدرس اور مدینہ منورہ کے (سابق) قاضی الشیخ عطیہ محمد سالمؒ (متوفی ۱۹۹۹) نے نماز تراویح کی چودہ سو سالہ تاریخ پر عربی زبان میں ایک مستقل کتاب (التراویحُ أکثرُ مِنْ ألْفِ عَامٍ فِی الْمَسْجِدِ النبوی) لکھی ہے۔ کتاب کے مقدمہ میں تصنیف کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مسجد نبوی میں نماز تراویح ہو رہی ہوتی ہے تو بعض لوگ آٹھ رکعت پڑھ کر ہی رک جاتے ہیں، ان کا یہ گمان ہے کہ آٹھ رکعت تراویح پڑھنا بہتر ہے اور اس سے زیادہ جائز نہیں ہے، اس طرح یہ لوگ مسجد نبوی میں بقیہ تراویح کے ثواب سے محروم رہتے ہیں۔ ان کی اس محرومی کو دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے، لہٰذا میں یہ کتاب لکھ رہا ہوں؛ تاکہ ان لوگوں کے شکوک وشبہات ختم ہوں اور ان کو بیس رکعت تراویح پڑھنے کی توفیق ہوجائے.... اس کتاب میں ۱۴۰۰ سالہ تاریخ پر مدلل بحث کرنے کے بعد شیخ عطیہ محمد سالمؒ لکھتے ہیں:

اس تفصیلی تجزیہ کے بعد ہم اپنے قرار سے اولاً تو یہ پوچھنا چاہیں گے کہ کیا ایک ہزار سال سے زائد اس طویل عرصہ میں کسی ایک موقع پر بھی یہ ثابت ہے کہ مسجد نبوی میں مستقل آٹھ تراویح پڑھی جاتی تھیں؟ یا چلیں بیس سے کم تراویح پڑھنا ہی ثابت ہو؟ بلکہ ثابت تو یہ ہے کہ پورے چودہ سو سالہ دور میں بیس یا اس سے زائد ہی پڑھی جاتی تھیں۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا کسی صحابی یا ماضی کے کسی ایک عالم نے بھی یہ فتویٰ دیا کہ ۸ سے زائد تراویح جائز نہیں ہیں اور اس نے حضرت عائشہؓ کی حدیث کو اس فتوے کی بنیاد بنایا ہو؟

❁ ❁ ❁

مسائل کلامیہ کے باب میں مصنّفاتِ امامِ نانوتویؒ استفادہ کا منہاج

(۱)

از: فخر الاسلام مظاہری علیگ
ایم.ڈی میڈیسن،
پروفیسر احمد غریب یونانی میڈیکل کالج اکل کوا

حضرت شیخ الہندؒ کی تحریر فرمودہ یہ عبارت ہے کہ ''خدامِ عالیہ مدرسہ دیوبند نے تو یہ تہیہ بنامِ خدا کرلیا ہے کہ تالیفاتِ موصوفہ (یعنی تصنیفاتِ امامِ نانوتویؒ-ف)....کسی قدر توضیح وتسہیل کے ساتھ عمدہ چھاپ کر اور نصابِ تعلیم میں داخل کرکے، اِن کی ترویج میں اگر حق تعالیٰ توفیق دے، تو جان توڑ کر ہر طرح کی سعی کی جائے اور اللہ کا فضل حامی ہو، تو وہ نفع جو اُن (حامیانِ اسلام-ف) کے ذہن میں ہے (امام قاسم نانوتویؒ کی تصنیفات کے ذریعہ-ف) اوروں کو بھی، اس کے جمال سے کامیاب کیا جائے۔'' اِس کی روشنی میں اپنی بعض معروضات پیش کرنے کی جسارت کررہا ہوں۔

شیخ الہند اکیڈمی سے امامِ قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی چند کتابیں شائع ہوئی ہیں، وہ حضرت شیخ الہندؒ کے خواب کی تعبیر اور حضرتؒ کے عزم کی جانب پیش رفت معلوم ہوتی ہے، جیسا کہ شائع شدہ کتاب کے حرفِ آغاز میں اس عزم کا اظہار اِن الفاظ میں کیا گیا ہے کہ اکیڈمی نے مولانا نانوتویؒ کی ''کتابوں کو بھی شائع کرنے اور ان سے استفادہ کو سہل بنانے کے خیال سے صاف ستھرے انداز میں طبع کرانے کا عزم کیا ہے'' پھر ''حرفِ آغاز'' ہی میں یہ بھی لکھا ہے کہ ''آج کے زمانہ کا اسلوبِ تحریر ایک صدی قبل کے اسلوبِ تحریر سے مختلف ہے...اسی لیے پرانی کتابوں کو پڑھتے ہوئے لوگ گھبراتے ہیں، اس پریشانی اور مشکل صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے اکیڈمی نے پیراگراف کا خیال رکھنے، کومے اور فل اسٹوپ وغیرہ لگانے کا التزام کیا ہے، نیز بعض وہ الفاظ جو اُس دور میں مستعمل تھے اور آج متروک ہیں، یا بہت مشکل معلوم ہوتے ہیں جن کے

معنی سمجھ میں نہیں آتے، ان الفاظ کو باقی رکھتے ہوئے، ان کے ہم معنی عام فہم الفاظ بریکٹ میں لکھ دیے گئے ہیں، اس سے یقیناً قارئین کو فائدہ ہوگا۔ علاوہ ازیں ضرورت کے مطابق یعنی مضمون کو قریب فہم کرنے کے لیے ذیلی سرخیال بھی لگادی گئی ہیں اور جہاں کہیں ضروری بات لکھنی پڑی، اسے حاشیہ پر لکھ دیا گیا ہے۔''

نیز یہ کہ ''مولانا بدرالدین صاحب ڈائرکٹر شیخ الہند اکیڈمی... کو اپنے اکابر سے اور ان کے علوم وفنون سے کتنا تعلق ہے، وہ ان کو نہ صرف محفوظ ہی رکھنا چاہتے ہیں؛ بلکہ فروغ دینے کے بھی آرزومند ہیں۔'' (مجموعہ ہفت رسائل ص۱۹، ۲۰)

ظاہر ہے کہ یہ بات بہت عمدہ اور لائقِ صد آفریں ہے جس کے لیے نہ صرف مولانا بدرالدین اجمل قاسمی صاحب؛ بلکہ جملہ اراکینِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند، بھی شکریے اور سپاس گزاری کے مستحق ہیں، جن کی تائید واجازت سے ''وقت کے تقاضہ کو پورا کرنے والا'' تصنیفات کا مجموعہ شائع ہوا۔ نیز سطور بالا میں اکابر کے علوم وفنون کی حفاظت اور انھیں فروغ دینے، کی جو بات کہی گئی ہے وہ بھی نہایت اہم ہے؛ کیوں کہ ان تصانیف سے استفادہ کرنے والا اس بات کو سمجھتا ہے کہ اِن کے الفاظ کی حفاظت، الفاظ کے ساتھ معانی کی حفاظت اور معانی کے ساتھ فکر کی حفاظت کس قدر ضروری ہے؟

اس اِجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب ہم یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ تمام ادیان وملل میں سے نجات، اسلام میں منحصر ہے اور اسلام کے نام پر بھی مختلف فرقوں میں سے ناجی فرقہ وہ ہے جو "ما انا علیه واصحابی" کا مصداق ہو، چنانچہ اِس کے مصداق، ابتداء ہی سے، وہ اہلِ حق رہے ہیں جو صحابہ اور سلف کے طریقہ پر قائم رہے۔ پھر اسلاف کے بعد اخلاف میں یہی سلسلہ چلتا رہا۔ بعد کی صدیوں میں، جب ہم ہندوستان کے حالات میں غور کرتے ہیں، تو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ، شاہ اسمٰعیل شہید دہلویؒ اور حضرت سید احمد شہید بریلویؒ وغیرہم کی جماعت اہلِ حق کی ترجمان کے طور پر نظر آتی ہے۔ پھر اِس جماعت کے بعد دین کے صحیح فکر ومسلک کی حفاظت کے لیے اکابر دیوبند کے محیر العقول کارنامے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ صرف کارنامے نہیں ہیں؛ بلکہ عقل ان کے کارناموں سے، ایسی دنگ اور حیران ہے کہ اِس دورِ مفتون میں اِس سے زیادہ کا تصور، جی ہاں مملکت تصور کی تمام تر وسعتوں کے باوجود، اس سے زیادہ کے تصور کی، عقل متحمل نہیں۔

ہندوستان بھر میں اِن اکابر دیوبند کا امتیاز یہ ہے کہ اِن کے پیش نظر سوائے دین کے اور کچھ نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے ڈیڑھ سو سال سے زائد عرصہ سے اہلِ حق کی ترجمان، یہی جماعت رہی ہے اور حکیم الامت مولانا تھانویؒ کے الفاظ میں ''حق کچھ ہمارے حضرات ہی میں منحصر سا معلوم ہوتا ہے۔'' (ملفوظات جلد ۱۲ ص ۱۸۰) اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ حق کی فکر کی صحیح ترین تعبیر ''فکرِ دیوبند'' ہے۔

اب فکرِ دیوبند کے مصداق پر بھی نظر کرنا چاہیے۔ جب اِس حیثیت سے غور کیا، تو معلوم ہوا کہ فکرِ دیوبند اصلاً منسوب ہے حجۃ اللہ فی الارض حضرت امام محمد قاسم نانوتویؒ اور قطب الارشاد امامِ ربانی حضرت رشید احمد گنگوہیؒ سے۔ اور جیسا کہ معلوم ہے کہ یہ دونوں حضرات، علوم ومعارف، حقائق و بصائر اور رشد واہتدائے ربانی کے امام حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے منتسبین میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا، حضرات اکابر دیوبند کی نظر میں جو مرتبہ ومقام ہے، وہ نہایت اعلیٰ وارفع ہے، جس کا اندازہ ذیل کے اقتباسات سے ہوسکتا ہے، حکیم الامت مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں:

''حضرت حاجی صاحبؒ نے صرف کافیہ تک پڑھا تھا اور ہم نے اتنا پڑھا ہے کہ ایک اور کافیہ لکھ دیں؛ مگر حضرت کے علوم ایسے تھے کہ آپ کے سامنے علماء کی کوئی حقیقت نہ تھی۔'' (۱) یعنی علماء خود اپنے کو کچھ نہ سمجھتے تھے؛ لیکن فی الواقع وہ علماء کیسے تھے، اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ''حضرت حاجی صاحبؒ سے ایسے بڑے بڑے علماء مستفید ہوئے کہ اگر وہ علماء اپنے وقت میں اجتہاد کا دعویٰ کرتے تو چل جاتا اور وہ اس کو نباہ بھی دیتے''۔ (۲) اور اِن بڑے بڑے علماء میں حضرت امام محمد قاسم نانوتویؒ اور قطب الارشاد حضرت رشید احمد گنگوہیؒ جیسے سرخیل علماء شامل تھے۔ پھر امام محمد قاسم نانوتویؒ تو ''یوں فرماتے تھے کہ حضرت حاجی صاحبؒ کا کوئی تقویٰ کی وجہ سے معتقد ہے، کوئی کرامت کی وجہ سے، میں حضرت کے علم کی وجہ سے معتقد ہوں۔'' (۳) ایک اور جگہ حضرت حاجی صاحب کے علوم ومعارف کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہے ''حضرت (حاجی صاحبؒ) کی تحقیقات کو دیکھ لیجیے کہ بڑے بڑے متبحر علماء اور فضل وکمال رکھنے والے، حضرت کی تحقیق کے وقت انگشت بدنداں ہوجاتے تھے اور اُس وقت حضرت کی یہ شان معلوم ہوتی تھی۔

بنی اندر خود علومِ انبیاء بے کتاب وبے معید واوستاد'' (۴)

مزید فرماتے ہیں کہ: ''حضرت حاجی صاحب فلسفی نہ تھے؛ مگر آپ کے کلام کو فلسفی سمجھ بھی

نہیں سکتے...ایک چھوٹی سی تحریر، رسالہ وحدۃ الوجود، اب موجود ہے کہ فلسفی سر پٹخ کر مرجاویں، تو اس جیسی تحقیق کرنا تو درکنار، اس کو سمجھ بھی نہیں سکیں گے۔'' (۵)

امام قاسم نانوتویؒ کی تصنیف آبِ حیات کے متعلق مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے یہ صراحت کی ہے کہ ''سیدنا الامام الکبیر کی تمام کتابوں میں سب سے زیادہ ادق اور حد سے زیادہ عمیق لطائف وحقائق پر مشتمل ہے'' لیکن اِس کتاب کو، حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں حضرت امام نانوتویؒ جس غرض سے لے کر گئے، اس کا حال خود حضرت نانوتویؒ سے سنیے، فرماتے ہیں:

''بامید ہائے چند در چند، ایک بار حضرت پیر ومرشد ادام اللہ فیوضہ کے گوش گزار کردینا یا ملاحظہ سے گزار دینا ضروری سمجھا۔''

جب کتاب حضرت حاجی صاحبؒ کو سنادی گئی، اس کے بعد حضرت نانوتویؒ ارشاد فرماتے ہیں ''اپنی کم مائیگی اور ہیچ مدانی کے سبب جو تحریر مذکور، کی صحت میں تردد تھا، رفع ہوگیا...پھر کوئی یہ سمجھے اور متعجب ہو کہ قاسم نادان کی تحقیق اور تنقیح اور ایسی مستحسن وصحیح

ع زبان گنگ وچنیں نغمہ خوش آئندہ

میں کہاں اور یہ مضامین عالی کہاں، یہ سب اسی شمس العارفین (حاجی صاحب قبلہ) کی نور افشانی ہے۔ یہاں بھی مثل زبان دوست وقلم، واسطہ ظہور مضامین مکنونہ دل عرش منزل ہوں.... جب زبانِ فیض ترجمان سے آفرین وتحسین سن لی، تو اصل مضامین کی حقیقت تو اپنے نزدیک محقق ہوگئی۔'' (۶)

یہ ہے مقام ومرتبہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا، حضرات اکابر دیوبند کی نظر میں۔ اِس طرح حضرت حاجی صاحبؒ تو سب کی اساس ہیں۔ اُن کے بعد حجۃ الاسلام حضرت امام قاسم نانوتویؒ اور قطب الارشاد امام ربانی حضرت رشید احمد گنگوہیؒ ہیں اور دراصل یہی دونوں حضرات گویا اِس فکر دیوبند کے متن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِن کے بعد اِس فکر کی تتمیم وتکمیل چار اماموں سے ہوتی ہے اور وہ ائمہ اربعہ یہ ہیں: مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ۔

اس طرح یہی ''سبعہ سیارہ'' ہیں جن کی طرف فکر دیوبند منسوب ہے۔ اور یہ ایسے حضرات ہیں جن کی نسبت عموماً اور حضرت نانوتویؒ وحضرت گنگوہیؒ کے متعلق خصوصاً حکیم الامت مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں کہ: ہمارے اکابر کے ملفوظات وتحقیقات دیکھ لو، معلوم ہوجائے گا کہ اِس

زمانے میں بھی رازی اور غزالی موجود ہیں... فرق صرف یہ ہے کہ اُن کا (رازی وغزالی کا - ف) زمانہ اِس قدر فتن اور شرور کا نہ تھا، جیسا کہ اب ہے۔ یہ سب اِن حضرات کی تصنیفات اور تحقیقات دیکھنے سے معلوم ہوسکتا ہے؛ مگر ان کو دیکھتا کون ہے؛ کیونکہ مذاق ہی بگڑ گیا ہے۔'' (۷) ''مخالفین تو ہمارے حضرات کو کیا پہچانتے، جو معتقدین اور موافقین ہیں، انھوں نے بھی اِن حضرات کو جیسا کہ حق ہے نہیں پہچانا۔'' (۸)

فکر دیوبند کی اِس فہم کے بعد ہماری نظر اِس پر جاتی ہے کہ مولانا بدرالدین اجمل قاسمی صاحب مدظلہٗ نے ایک بات تصانیف نانوتویؒ کے حوالے سے ''وقت کے تقاضہ کو پورا'' کرنے کی بھی فرمائی ہے اور یہ بات نہایت اہم ہے؛ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ اِس آخری دور میں ضرورت اسی کی ہے کہ ایک طرف تو حالاتِ حاضرہ علومِ جدیدہ اور سائنسی مزاج ورجحان کے زیر اثر پیدا ہونے والے شبہات پر امام الاصول مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے اصولوں کا اِطلاق وانطباق بالدلائل دکھلا دیا جائے، گویا خارجی حملوں سے اسلام کی حفاظت کی ایک فصیل قائم کردی جائے اور دوسری طرف امام الفروع مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی تنظیم واِنصرام اور نظم ونسق سے اسلام کی داخلی بناؤں کا انتظام اور رکاوٹوں سے حفاظت کا اہتمام بتمامہ وکمالہ ہو۔ پھر اسلام کے اِن دونوں اماموں کی مذکورہ دونوں حیثیتوں کے بہترین شارح یعنی جامع الاصول والفروع حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تحقیقات منصۂ شہود پر لاکر، ان کے فوائد کو عام وتام کردیا جائے۔

لیکن اِس وقت ہماری گفتگو علم کلام کے باب میں ہے؛ لہٰذا اِس نقطۂ نظر سے ایک بات تو یہ عرض ہے کہ مجموعۂ ہفت رسائل میں سے چار رسائل جو مذکورہ موضوع علم کلام جدید سے تعلق رکھتے ہیں، اُن کو الگ سے شائع کردیا جائے۔ یعنی (۱) ''قبلہ نما'' (۲) ''جواب ترکی بہ ترکی'' (۳) ''مذہبی گفتگو'' (۴) ''تحفۂ لحمیہ''۔ پھر اس کے ساتھ ''حجۃ الاسلام''، ''انتصار الاسلام''، ''تقریر دل پذیر'' کے بعض اجزاء اور ''آب حیات'' جس میں علاوہ اُس خاص مسئلہ کے جو اِس رسالہ کا خاص موضوع ہے، جن بے شمار اسرار ونکات سے پردہ اُٹھایا گیا ہے، اُن میں سے بعض کا ماحصل بھی (اگر ہوسکے)، جب یہ بھی شامل ہوجائیں گے، تو بیرونی حملوں سے اسلام کی حفاظت کا قلعہ مضبوط ومستحکم ہوجائے گا۔ اور بہت زیادہ مشکل یہ، یوں نہیں ہے کہ متعدد جگہوں پر سابق مضمونوں کی یا دوسری کتابوں کی تفسیر یا تسہیل حضرت نانوتویؒ کے قلم سے خود ہی موجود ہے۔ اس کے بعد اندرونی دشمنوں سے یعنی مسلمان اہل زیغ، نیم ملحدوں اور فطرت پرستوں کے لیے امام قاسم

نانوتویؒ کی کتاب ''تصفیۃ العقائد'' اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتاب ''الانتباہات المفیدہ عن الاشتباہات الجدیدہ'' بالکل کافی ہیں۔ اول الذکر کتاب اکیڈمی سے شائع ہوچکی ہے اور ثانی الذکر کی تعریب مع تشریح کے اکیڈمی سے شائع ہوئی ہے؛ لیکن صرف نصف کتاب یعنی آٹھ انتباہات تک شائع ہوئی ہے؛ جب کہ کتاب کل ۱۶، انتباہات پر مشتمل ہے۔ گویا اِس کتاب کا نصف آخر شائع ہونا باقی ہے۔

یہ سب کتابیں، جب اپنی تشریح، تسہیل اور جزئیات پر انطباق کے ساتھ، نیز وقت کے فکری مستوی پر اطلاقی حیثیت کے ساتھ آجائیں گی، تو کسی رازی وغزالی کی حسرت نہ رہ جائے گی، جیسا کہ بعض مفکرین اس تشنگی اور حسرت کا اظہار کرچکے ہیں، چنانچہ جناب شہاب الدین احمد ندوی مرحوم سرسید کے متعلق لکھتے ہیں کہ انھوں نے ''قرآن کو توڑ مروڑ کر افکارِ جدیدہ سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش ضرور کرڈالی۔'' ''حالاں کہ کرنے کا کام اس کے برعکس یہ تھا کہ نصوص قرآنیہ پر راسخ العقیدگی کے ساتھ ایمان رکھتے ہوئے افکار جدیدہ کو باطل یا مشتبہ ٹھہرادیا جاتا۔ اور یہ ضرورت آج بھی باقی ہے اور اسی اعتبار سے آج ایک نئے غزالی، ایک نئے رازی اور ایک نئے ابن تیمیہ کی ضرورت ہے۔''

لیکن افسوس ہے کہ! جناب شہاب الدین احمد ندوی مرحوم کو شاید امام قاسم نانوتویؒ اور حکیم الامت مولانا تھانویؒ کی کلامی تحقیقات دیکھنے کا موقع نہ مل سکا، ورنہ وہ گواہی دیتے کہ ''ایک نئے غزالی، ایک نئے رازی کی ضرورت'' باحسن وجوہ پوری ہوگئی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ وقت کے فکری مستوی، زمانہ کی کسوٹی کی حقیقت اور زمانہ حال کے Juriceprudence کا سراب، اِن سب تناظر میں اسلام کی ابدیت، مذکورہ کتابوں میں، نہایت موثر طریقہ پر دکھادی گئی ہیں، جس کے بعد اس مرعوبیت کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ: ''اس وقت مذہب اسلام گویا زمانہ کی کسوٹی پر کسا جارہا ہے جو شخص زمانہ حال کے Juriceprudence پر تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا، وہ بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم اور شاید اسلام کا مجدد ہوگا۔''

مولانا نانوتویؒ کے بعد حکیم الامت مولانا تھانویؒ کو داخلی حملوں سے اسلام کی حفاظت کا بہت زیادہ اہتمام تھا، یعنی خود مسلمانوں کی طرف سے اسلام پر پڑنے والے شبہات اور علومِ جدیدہ کی راہ سے مسلمانوں کے ذہنوں میں پنپنے والے خلجانات کے ازالہ کا بہت زیادہ احساس تھا، جس کا تذکرہ ایک مجلس میں اس طرح فرمایا:

''روز بروز علومِ دین کی کمی لوگوں میں ہوتی جاتی ہے۔ مجھے تو یہ خوف ہے کہ اپنے حضرات کے بعد پسماندگان کا طبقہ بددینوں کے جواب بھی شائد نہ دے سکے اور اسی وجہ سے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ ایک رسالہ علم کلام جدید میں لکھا جائے.....اس وقت تو بحمداللہ ایسے علماء موجود ہیں کہ اگر مجھے کسی مقام پر شبہ ہو، تو ان سے رجوع کرسکتا ہوں۔''(۹) اسی احساس کے تحت الانتباہات المفیدہ لکھی گئی۔

بددینوں اور بدفکروں کے اعتراضات جن کی طرف مولانا تھانویؒ نے اشارہ کیا، ان پر بھی ایک نظر ڈال لینا مناسب ہے؛ تاکہ سطور بالا میں ذکر کی گئی کتابوں کی قدر معلوم ہو کہ الحمدللہ اہل حق کے عقائد وافکار کے تحفظ کی تدبیر اور دین کی حفاظت کا انتظام ہمارے پاس موجود ہے۔ یہاں بطور نمونہ اہل زیغ کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں، جن سے اُن کے اعتراضات اور خود ساختہ تجویزات کا اندازہ ہوسکے گا:

''نئے علوم وفنون بالخصوص فلسفہ جدیدہ (سائنس-ف) کی تعلیم سے طلبہ کے عقائد میں خلل وفساد واقع ہوتا ہے وہ اس کلام (علم کلام-ف) سے دور نہیں ہوسکتا جسے عباسی دور کے متکلمین نے یونانی فلسفہ کے نقصانات کے لیے ایجاد کیا تھا اور نہ ہی قدیم علم کلام کی تعلیم سے ان اعتراضات کے دفاع کی صلاحیت پیدا ہوسکتی ہے جو جدید فلسفہ اور سائنس کی روشنی میں اسلامی عقائد وتعلیمات پر عائد کیے جاتے ہیں۔'' (سرسید اور علوم اسلامیہ ''سرسید کا تصور تعلیم'' ص ۱۵۹، از ظفر الاسلام اصلاحی بحوالہ خطبات سرسید ۲/۲۹۴، ۲۹۸)

''جو کتب مذہبی ہمارے یہاں موجود ہیں اور پڑھنے پڑھانے میں آتی ہیں، ان میں کونسی کتاب ہے جس میں فلسفہ مغربیہ اور علوم جدیدہ کے مسائل کی تردید یا تطبیق، مسائل مذہبیہ سے کی گئی ہو۔'' (ایضاً ص ۱۵۹ بحوالہ تعلیم مذہبی از سرسید احمد خاں، و نیز حیات جاوید ص ۲۱۵ تا ۲۱۸ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، پانچواں ایڈیشن ۲۰۰۴ء)

انیسویں صدی میں ''امتِ مسلمہ کو غیر مسلم اقوام.....کے علمی، دینی اور تہذیبی حملوں کا سامنا تھا، علمائے امت اپنے طریقے سے ان کا مقابلہ کررہے تھے؛ مگر ان کا دفاع ناکافی بھی تھا، ناقص بھی اور معذور بھی۔'' (پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی علوم اسلامیہ اور سرسید ص ۵، ۷)

''ہمارے علماء جو فلسفۂ قدیم اور علومِ دینیہ میں تمام قوم کے نزدیک مسلم الثبوت ہیں اور جن کا یہ منصب تھا کہ فلسفۂ جدیدہ کے مقابلہ میں اسلام کی حمایت کے لیے کھڑے ہوتے، ان کو یہ بھی خبر

نہ تھی کہ یونانی فلسفہ کے سوا کوئی اور فلسفہ اور عربی زبان کے سوا کوئی اور علمی زبان بھی دنیا میں موجود ہے، وہ اس بات سے بالکل بے خبر تھے کہ علوم جدیدہ نہ صرف کرسچینیٹی یا صرف اسلام کی بلکہ تمام دنیا کے مذاہب کی جڑ کاٹ رہے ہیں۔ اور اگر بالفرض وہ اسلام کی حمایت کا کوئی نیا طریقہ مقتضائے وقت کے موافق اختیار کرنے کا ارادہ بھی کرتے، تو ہرگز امید نہ تھی کہ وہ اپنے ارادہ میں کم وبیش کامیابی حاصل کرسکتے، ان کو تقلید کی عادت نے ہرگز اس قابل نہیں رکھا کہ وہ قدماء کی پیروی کے دائرہ سے قدم باہر رکھ سکیں۔'' (حیات جاوید ص ۲۱۶، ۲۱۷)

''اور جو طریقہ دین کی حمایت کا بمقابلہ یونانی فلسفہ کے ہمارے قدیم متکلمین نے اختیار کیا تھا، وہ اِس زمانے میں کچھ کارآمد نہیں رہا؛ یہاں تک کہ جو مصنّفین اِس زمانے میں اُس طریقے پر کاربند ہوتے ہیں، اُن کی تصنیفات سے تعلیم یافتہ لوگوں کی تشفی نہیں ہوتی اور جو شبہات مذہب کی نسبت کے دل میں خطور کرتے ہیں وہ بدستور کھٹکتے رہتے ہیں۔'' (حیاتِ جاوید ص ۲۱۶، ۲۱۷)

''موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں کا اولین اور اہم ترین کام یہ تھا کہ .... اسلام کی ابدی تعلیمات کو مؤثر اور طاقتور انداز میں پیش کریں؛ تاکہ آج کا انسان اور جدید مسلم نسل اس کو پڑھے اور اس کے ذریعہ سے اپنے کھوئے ہوئے عقیدہ کو دوبارہ حاصل کرے۔'' ''میں اپنے چالیس سالہ مطالعہ کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس پورے دور (انیسویں اور بیسویں صدی) میں مسلمانوں کا دینی طبقہ کوئی ایک بھی ایسی قابل ذکر کتاب وجود میں نہ لا سکا جو جدید سائنٹفک اسلوب اور وقت کے فکری مستوی پر اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے والی ہو۔'' (فکری غلطی ص ۲۷۵ بحوالہ الرسالہ جولائی ۱۹۸۹ء ص ۱۵، ۱۶)

''ضروری ہے کہ ہمارے علماء ... سائنسی نقطۂ نظر سے ان مادہ پرستانہ دعووں کی نامعقولیت پوری طرح ثابت کردیں۔ یہ عصر جدید کا ایک تجدیدی کارنامہ ہوگا اور دین ومذہب کی بہت بڑی خدمت بھی۔ اسی کا نام علم کلام ہے اور یہ موجودہ دور کی ایک اہم ترین علمی ضرورت ہے۔''

''ایک علم کلام وہ تھا جس کو ہمارے متقدمین نے قرون وسطیٰ میں یونانی فلسفہ کے مقابلہ کے لیے ایجاد کیا تھا جب کہ موجودہ علم کلام وہ ہے جو جدید علوم ونظریات اور خاص کر مادی افکار وفلسفوں کے مقابلہ کے لیے مطلوب ہے.... اگر ہمارے ارباب فکر ونظر نے موجودہ حالات کی سنگینی کو محسوس نہ کیا اور ان کے تدارک کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا تو پھر آنے والا وقت ہمیں کبھی معاف نہیں کرسکتا۔''

''جدید علم کلام کا دائرہ اب صرف عقائد تک محدود نہیں رہا؛ بلکہ وہ عبادت واخلاق اور تمام معاملات زندگی تک وسیع ہوگیا ہے.... ذہنی وفکری اعتبار سے کوئی انقلاب برپا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی نظام حیات کو ایک نئے فلسفے یا نئے کلام کے روپ میں پیش کیا جائے.... موجودہ دور عقلیت پسندی Rationalism کا دور ہے اور آج لوگوں کو وہی چیزیں مطمئن کرسکتی ہیں جو عقلی واستدلالی اعتبار سے مُسَلَّمات اور تسلی بخش ہوں۔ محض وعظ ونصیحت سے کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا؛ کیوں کہ آج زمانہ کی قدریں Values بدل چکی ہیں۔'' (مقدمہ تخلیق آدم اور نظریہ ارتقا، ص۲۲، ۲۳، از شہاب الدین احمد ندوی)

''ابتدائی صدیوں میں، جب اسلام کے عقائد پر فقہائے اسلام اور متکلمین کام کررہے تھے، تو اسلام کے عقائد پر جو اعتراضات اور حملے یونانیوں کی طرف سے ہورہے تھے... ان اعتراضات کا جواب علماء اور متکلمین نے احادیث کی روشنی میں دیا۔ آج اسلام اور اسلام کے عقائد پر وہ اعتراضات نہیں ہورہے ہیں۔ قدیم یونانی فلسفہ ختم ہوگیا... آج نئے انداز سے حملے ہورہے ہیں، آج اسلامی عقائد اور تعلیمات پر مغربی نظریۂ علم کے حوالہ سے اسلام پر اور ہی انداز کے اعتراضات ہورہے ہیں، آج مغربی نفسیات نبوت پر اعتراض کررہی ہے۔ آج کی سائیکالوجی نبوت کو بطور ماخذ علم نہیں مانتی، وحی کو بطور مصدرِ علم نہیں مانتی''۔ ''وحی بطور ذریعہ علم کے قابل قبول ہے کہ نہیں، ابھی اس کے ماننے میں بھی آج کے انسان کو تردد ہے۔'' ''آج فن تاریخ، آرکیالوجی اور آثارِ قدیمہ کے نقطۂ نظر سے اعتراضات ہورہے ہیں۔'' (محاضرات حدیث ص۴۵۷ تا ۴۵۹ از محمود احمد غازی)

سرسید نے ''اپنے جدید علم کلام کا موضوع اور اسلام کا حقیقی مصداق محض قرآن مجید کو قرار دیا اور اس کے سوا تمام مجموعہ احادیث کو اس دلیل سے کہ اس میں کوئی حدیث مثل قرآن کے قطعی الثبوت نہیں ہے اور تمام علماء ومفسرین کے اقوال وآراء اور تمام فقہاء ومجتہدین کے قیاسات واجتہادات کو، اس بنا پر کہ ان کے جوابدہ خود علماء ومفسرین اور فقہاء ومجتہدین ہیں نہ اسلام، اپنی بحث سے خارج کردیا۔''

پھر حاشیہ میں اس رجحان اور روش کے مویّد ''شمس العلماء'' کے خطاب کے اعزاز یافتہ حالی لکھتے ہیں: ''لیکن جو لوگ مذہب اسلام کا اطلاق مجموعہ کتاب وسنت واجماع وقیاس پر کرتے ہیں، ان کو اسلام کی حمایت کے لیے ضرور ہے کہ وہ اس تمام مجموعہ کو سائنس کے حملے سے بچائیں، عام

اِس کے کہ اس کو سائنس کے مسائل پر منطبق کریں، یا اس کے مقابلہ میں سائنس کے مسائل کا بطلان ثابت کریں یا ان کو غیر محقق ٹھیرائیں۔'' (۱۰)

علماء پر الزام یہ ہے کہ ''...بزرگانِ سلف نے نہایت بے تعصبی کے ساتھ معترضوں کے ہر قسم کے اعتراض کو سنا اور ان کو اپنی تصنیفات میں درج کرکے، ان کے جواب دیے، بخلاف اس کے آج ہمارے علماء یہ تلقین کرتے ہیں کہ دشمن کو آتا دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کرلینی چاہئیں۔'' (شبلی۔الکلام ص۲)

لیکن اِس باب میں نوعیت وحقیقت جو کچھ ہے، اسے جدید علوم وافکار پر نظر رکھنے والے جدید دور کے ایک محقق پروفیسر محمد حسن عسکری نے ظاہر کردیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ: ''مغربی تعلیم سے متاثر ہونے والے لوگ کوئی ایسا شبہ یا اعتراض نہیں لا سکتے جس کا جواب ہمارے پاس نہ ہو۔ یہ بات سو فیصدی درست ہے، گمراہی کی جتنی بھی نئی شکلیں سامنے آئی ہیں، یا آسکتی ہیں، وہ بنیادی طور پر وہی ہیں جن سے اسلامی علماء کو تاریخ میں پہلے بھی واسطہ پڑچکا ہے۔'' آگے لکھتے ہیں، مگر نئی گمراہیاں چند باتوں میں اختصاص اور امتیاز رکھتی ہیں:

(۱) پہلے گمراہیوں کا دائرہ بہت محدود تھا، رقبے کے لحاظ سے بھی اور گمراہیوں کی تعداد کے لحاظ سے بھی۔....مگر نئی گمراہیوں کا دائرہ عالمگیر ہے۔

(۲) یہ گمراہیاں اپنے ساتھ سائنس کی ایسی ایجادات بھی لائی ہیں جس کے اثر کے تحت لوگ ذہن سے کام نہیں لیتے، حسی مشاہدات کو ہی عقلی دلیل سمجھتے ہیں۔

(۳) یورپ نے پچھلے چھ سو سال میں جتنی گمراہیاں پیدا کی ہیں، ان سب نے ایک ساتھ ہمارے اوپر حملہ کیا ہے....خود ہمارے یہاں بھی پچھلے ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں، عام لوگوں کا اور خصوصاً جدید تعلیم پانے والوں کا ذہن آہستہ آہستہ مسخ ہوتا چلا گیا ہے۔

(۴) زبان اور اصطلاحات کا فریب: مہمل سے مہمل نظریہ بھاری بھرکم اصطلاحات کے پردے میں اِس طرح چھپ جاتا ہے کہ آدمی خواہ مخواہ مرعوب ہوجاتا ہے۔ یہ الفاظ واصطلاحات دو قسم کی ہیں: ایک تو بھاری بھرکم پیچیدہ الفاظ ہیں جن کا بعض دفعہ کوئی مطلب نہیں ہوتا؛ مگر علمیت ضرور ٹپکتی ہے۔ لکھنے والوں کی تحریر میں ایسی اصطلاحات کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ پڑھنے والا کوئی مطلب اخذ نہیں کرسکتا، اور اس کا ذہن معطل ہوجاتا ہے، دوسرے وہ اصطلاحات ہیں جو بظاہر خوشنما ہوتی ہیں اور براہ راست جذبات کو متاثر کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ دونوں قسم کی اصطلاحات کا مقصد اصل میں یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا اپنے ذہن سے کام نہ لے سکے۔'' (جدیدیت ص۱۷)

اس تمام گفتگو کے بعد، جہاں تک امام قاسم نانوتویؒ کی تصانیف سے استفادہ کا تعلق ہے، تو چونکہ حضرت امام قاسم نانوتویؒ کی تصانیف حقائق شرعیہ کے سلسلہ میں غامض دلائل پر مشتمل ہیں، جن کے سمجھنے میں قوتِ فکریہ کو جب تک پورے طور پر یکسو نہ رکھا جائے، ساتھ ہی فنونِ عقلیہ اور علومِ ضروریہ سے مناسبت نہ ہو، نیز بعض مضامین کو جب تک کئی کئی مرتبہ نہ پڑھا جائے، ہم جیسوں کے لیے ان کا سمجھنا از حد دشوار ہے، دوسری طرف عقائد کی حفاظت اور افکار کی اصلاح کے لیے، خصوصاً اُن اہل علم جو عقائد اسلام کو غیروں کے حملوں سے بچانے کے جذبے سے اسلام کے دفاع کا کام کرتے ہیں، اُن کے واسطے ان کتابوں سے اِستفادہ از بس ضروری ہے۔ جس کی اہمیت کو محسوس فرماتے ہوئے حضرت شیخ الہندؒ نے نہایت صاف لفظوں میں فرمایا تھا کہ: ''طالبانِ حقائق اور حامیانِ اسلام کی خدمت میں ہماری یہ درخواست ہے کہ تائید احکامِ اسلام اور مدافعت فلسفہ قدیمہ وجدیدہ کے لیے جو تدبیریں کی جاتی ہیں، ان کو بجائے خود رکھ کر حضرت خاتم العلماء کے رسائل کے مطالعہ میں بھی کچھ وقت ضرور صرف فرماویں اور پورے غور سے کام لیں اور انصاف سے دیکھیں کہ ضروریاتِ موجودہ زمانہ حال کے لیے وہ سب تدابیر سے فائق اور مختصر اور بہتر اور مفید تر ہیں یا نہیں.... باقی خدامِ عالیہ مدرسہ دیوبند نے تو یہ تہیہ بنامِ خدا کرلیا ہے کہ تالیفاتِ موصوفہ.... کسی قدر توضیح وتسہیل کے ساتھ عمدہ چھاپ کر اور نصابِ تعلیم میں داخل کرکے، اِن کی ترویج میں اگر حق تعالیٰ توفیق دے، تو جان توڑ کر ہر طرح کی سعی کی جائے اور اللہ کا فضل حامی ہو، تو وہ نفع جو اُن (حامیانِ اسلام-ف) کے ذہن میں ہے (یعنی حمایت اسلام، تائید احکامِ اسلام، نیز مدافعت فلسفہ قدیمہ وجدیدہ اور افکارِ زائغہ کی اصلاح کا نفع، جس کے لیے ایک عمدہ تدبیر، اِن موضوعات پر مولانا نانوتویؒ کی تصانیف ہیں، اِن تصانیف سے نفع نہ صرف اُن کو حاصل ہو؛ بلکہ-ف) اوروں کو بھی، اس کے جمال سے کامیاب کیا جائے۔'' (حجۃ الاسلام ص ۱۶، ۱۷)

(باقی آئندہ)

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا قول ''امْصَصْ بَظْرَ اللات'' کی تحقیق پر ایک نظر

از: مولانا عمر فاروق لوہاروی

❁ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب عروہ بن مسعود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا:

''اگر یہ صورت ہوئی کہ قریش کو آپ پر غلبہ حاصل ہوگیا، تو واللہ! میں (آپ کے اردگرد) رلے ملے اور مختلف النوع لوگوں کو دیکھ رہا ہوں، جو اس لائق ہیں کہ آپ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں''۔

قبائل جب مخلوط ہوتے ہیں، تو مشکل گھڑی میں بعض کو چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں؛ لیکن جب مستقل ایک قبیلہ ہو، تو آدمی دوسرے افراد کو چھوڑ کر بھاگنے کو عار خیال کرتا ہے۔ عروہ بن مسعود نے قبائلی طور طریق کے پیش نظر مذکورہ جملہ کہا تھا۔ عروہ کو یہ پتا نہیں تھا کہ قرابت اور رشتہ داریوں سے بڑھا ہوا ایمان کا رشتہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان کے ذریعہ مؤمنین کے دلوں کو باہم ایسا مربوط کیا تھا، جو نسبی رشتہ داریوں کے ربط وجوڑ سے یقیناً کہیں زیادہ قوی ومستحکم تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عروہ کی بات سن کر فرمایا:

امْصَصْ بَظْرَ اللات، أنحنُ نَفِرُّ عنه ونَدَعُه. (صحیح بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد، ص:۳۷۸، ج:۱، قدیمی: کراچی)

''تو لات کی شرم گاہ چوس! کیا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے راہِ فرار اختیار کریں گے اور آپ کو چھوڑ دیں گے؟

'فتاویٰ دارالعلوم زکریا' میں اس کے متعلق حسبِ ذیل سوال وجواب درج ہے:

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول امصص بظر اللات کی تحقیق:

سوال: ''صحیح بخاری'' میں ہے کہ جب عروہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا کہ اگر آپ اپنی

قوم کا استیصال کریں گے اور اگر مغلوب ہوئے، تو یہ مختلف النوع لوگ آپ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے، تو اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا:

"امصص بظر اللات".

اس کے معنی شارحین لکھتے ہیں:

''چوستے رہو لات کی شرم گاہ''۔ (بخاری شریف ۱/۳۷۸، باب الشروط فی الجہاد)

یہ گالی بظاہر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان صدیقیت کے خلاف ہے۔ نیز قرآن کریم کی آیت ہے:

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾

یہ اس کے بھی منافی ہے، اس اشکال کا کیا حل ہے؟

قادیانی اس جملہ سے مرزا کی مغلظات کی صحت پر استدلال کرتے ہیں۔ مثلاً مرزا نے اپنے نہ ماننے والوں کو کنجریوں کی اولاد کہا ہے اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گوہ کا ڈھیر اور اپنے دشمنوں کو بیابانوں کے خنزیر کہا ہے۔ یہ سب گالیاں مرزا قادیانی نے اپنی کتابوں میں لکھی ہیں۔ نیز شیعہ اس جملہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بدزبانی پر استدلال کرتے ہیں۔

جواب: **بظر** کے دو معنی ہیں:

(۱) شرم گاہ کا ابھرا ہوا حصہ۔

(۲) ہونٹ کے درمیان کا ابھرا ہوا حصہ (القاموس الوحید: ۱۷۱) چناں چہ **بظر** کے معنی "الشفة العليا" بھی ہے۔ (المعجم الوسیط: ۶۲)

اور یہاں دوسرے معنی مراد ہیں، جس کے قرائن یہ ہیں:

(۱) امصص کا لفظ قرینہ ہے؛ کیوں کہ چوسنے کی چیز ہونٹ ہے نہ کہ شرم گاہ۔

(۲) اسی حدیث میں مذکور ہے کہ صحابہ آں حضور ﷺ کا لعاب منہ پر لگاتے یا بدن پر لگاتے تھے اور آپ ﷺ کا بقیہ پانی پیتے تھے۔ (بخاری شریف ۱/۳۷۹)

مطلب یہ ہے کہ تم لات کے لعاب کو چوسو، ہم رسول اللہ ﷺ کے لعاب کو منہ پر لگاتے اور چوستے رہیں گے۔

(۳) عروہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر سب وشتم کا الزام نہیں لگایا، معلوم

ہوا یہ گالی نہیں تھی۔

(۴) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اُسے اچھے معنی پر محمول کیا جائے۔ واللہ اعلم (فتاویٰ دارالعلوم زکریا، کتاب الحدیث والآثار، ص: ۳۳۸، ۳۳۹، ج: ۱، زمزم پبلشرز کراچی، تاریخ اشاعت: نومبر ۲۰۰۷ء)

بندہ کہتا ہے:

سائل کو امصص بظر اللات کے معنی ''تو لات کی شرم گاہ چوس'' چندو جوہ سے ٹھیک معلوم نہیں ہوئے:

(۱) یہ گالی بظاہر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شانِ صدیقیت کے خلاف ہے۔

(۲) اِس آیت کے منافی ہے ﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ [الانعام: ۱۰۸]

ترجمہ: اور دشنام مت دو ان کو، جن کی یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں؛ کیوں کہ پھر وہ براہِ جہل حد سے گزر کر اللہ کی شان میں گستاخی کریں گے۔

(۳) قادیانی اس جملہ سے مرزا کی مغلظات کی صحت پر استدلال کرتے ہیں۔

(۴) شیعہ اس جملہ سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بدزبانی پر استدلال کرتے ہیں۔

مذکورہ امور میں سے ہر ایک کا جواب بالترتیب حسب ذیل ہے:

(۱) صلح حدیبیہ کے موقع پر ابتداءً حالات سلم وصلح کے نہیں تھے؛ بلکہ حالات جنگ کا رُخ اختیار کیے ہوئے تھے؛ چناں چہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے سر پر خود (آہنی ٹوپی) کا ہونا بھی اس کا قرینہ ہے، جس کا ذکر خود اس روایت میں ہے اور ظاہر ہے کہ حالاتِ جنگ کے اَحکام صلح کے اَحکام سے مختلف ہوتے ہیں اور جب میدانِ جنگ میں قتال بالسِّنان شانِ صدیقیت کے خلاف نہیں، تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جیسے معزز حضرات کی طرف فرار کی نسبت کرنے والے اور ان کے جذبۂ صدق ووفا پر نکتہ چینی کرنے والے سے جنگی حالات میں قتال باللسان بہ طریق اولیٰ شانِ صدیقیت کے خلاف نہیں۔

(۲) حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ''امصص بظر اللات'' سے عروہ کو دشنام وگالی دی تھی، لات بُت کو نہیں، ہاں! لات بُت کے لیے ''بظر'' یعنی شرم گاہ کا اثبات ضرور پایا گیا ہے؛ لیکن جب مشرکین لات بُت کو مؤنث قرار دیتے تھے، تو مؤنث کے لیے ''بظر'' یعنی شرمگاہ

کا اثبات گالی کیسے ہوا؟

جب یہ گالی لات بُت کو نہیں، تو آیتِ کریمہ ﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾. (الأنعام:۱۰۸) کے منافی بھی نہیں۔

(۳) جنگی حالات میں نبیِ صادق ومصدوق ﷺ کی موجودگی میں قتال باللسان سے نبوت کے جھوٹے مدعی مرزا کی مُغلّظات کی صحت پر استدلال کیسے ہوسکتا ہے؟ چہ نسبت خاک را بعالَمِ پاک؟

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

(۴) مذکورہ بالا امور سے اس کا جواب بھی ہوگیا۔

مجیب محترم نے "بظر" کے دو معنی ذکر کرکے ان میں سے بجائے "شرمگاہ" کے "ہونٹ کے درمیان کا ابھرا ہوا حصہ" یا "اوپر کا ہونٹ" والے معنی مراد لیے اور اس کے لیے چار قرائن پیش فرمائے ہیں۔ "قولہ" کے عنوان سے وہ قرائن اور "یقول العبد الضعیف" کے عنوان سے ان پر بندہ کی ناقص آرا، ذیل میں درج ہیں:

(۱) قولہ: امصص کا لفظ قرینہ ہے؛ کیوں کہ چوسنے کی چیز ہونٹ ہے نہ کہ شرمگاہ۔

یقول العبد الضعیف:

اس کو قرینہ ٹھہرانا اس پر مبنی ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے گالی کا ارادہ نہیں فرمایا تھا؛ حالاں کہ اس مبنیٰ ہی میں کلام ہے۔

درحقیقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس جملہ سے گالی ہی کا قصد فرمایا تھا۔ عرب عادتاً اس سے گالی دیتے تھے؛ لیکن اُمّ کے لفظ کے ساتھ، یعنی "امصص بظر أمك" کہتے تھے؛ چوں کہ مشرکین لات بُت کی تعظیم کرتے تھے؛ اس لیے عروہ کی گالی میں مبالغہ کے قصد سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے "اُمّ" کی بجائے اس معبودِ باطل کو ذکر کیا۔ قاضی عیاض، ابن بطال، علامہ کرمانی، ابن الملقن، بدرالدین زرکشی، حافظ ابن حجر عسقلانی، علامہ عینی، علامہ قسطلانی، شیخ الاسلام زکریا الانصاری، علامہ سیوطی، علامہ محمد تاوَدی، شیخ عبداللہ بن حجازی الشرقاوی، نواب صدیق حسن خاں قنوجی، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمہم اللہ، شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اور حضرت مولانا صوفی محمد سرور صاحب مدظلہما نے مذکورہ جملہ کو گالی ہی کے معنی میں لیا ہے۔ طوالت کے اندیشہ سے کتابوں کی عبارات کی بجائے

صرف حوالہ جات پر اکتفاء کیا جاتا ہے:

(۱) مشارق الأنوار، ص:۱۳۹، ج:۱، العلمية: بيروت

(۲) شرح صحيح البخارى لابن بطال، ص:۱۲۸،۱۲۹، ج:۸ مكتبة الرشيد: الرياض

(۳) شرح البخارى للكرمانى، ص:٤٣، ج:۱۲، دار إحياء التراث العربى: بيروت

(٤) التوضيح لشرح الجامع الصحيح، ص:٥٩، ج:۱۷، وزارة الاوقاف: قطر

(٥) التنقيح لألفاظ الجامع الصحيح، ص:٤۲۹، ج:۲، نزار مصطفى الباز: مكة المكرمة

(٦) فتح البارى، ص:٤۰۱، ج:٥، دارالريان: القاهرة

(۷) عمدة القارى، ص:۱۰، ج:۱٤، دار إحياء التراث العربى: بيروت

(۸) إرشاد السارى، ص:۲۰٦، ج:٦، العلمية: بيروت

(۹) منحة البارى بشرح صحيح البخارى المسمى تُحفَةُ البارى، ص:٥۲۹، ٥۳۰، ج:٥، الرشيد: الرياض

(۱۰) التوضيح على الجامع الصحيح، ص:۲۰۲، ج:۳، العلمية: بيروت

(۱۱) حاشية التاودى بن سودة على صحيح البخارى، ص:۹٦، ج:۳، العلمية: بيروت

(۱۲) فتح المبدى بشرح مختصر الزبيدى، ص:٤۹٤، ج:۲، العلمية: بيروت

(۱۳) عون البارى لحلّ أدلة صحيح البخارى، ص:۱۹٤، ج:٤، العلمية: بيروت

(۱٤) هامش لامع الدرارى، ص: ۱٦٦، ج:۷، المكتبة الإمدادية: مكة المكرمة

(۱۵) آپ بیتی حضرت شیخ الحدیث صاحب نور اللہ مرقدہ، ص:۳۸، ح:٦، معہد الخلیل الاسلامی: کراچی

(١٦) إنعام الباری دروس بخاری شریف، ص:٩٧٩، ج:٧، مکتبة الحراء: کراچی

(١٧) الخیر الجاری فی شرح صحیح البخاری، ص:١٨٧، ج:٣، ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ: ملتان

(۲) قولہ: اسی حدیث میں مذکور ہے کہ صحابہ آں حضورﷺ کا لعاب منہ پر لگاتے یا بدن پر لگاتے تھے اور آپﷺ کا بقیہ پانی پیتے تھے:

"قال: فَواللّٰہ ما تنخم رسول اللہ ﷺ نخامةً إلّا وقعت فی کفِّ رجلٍ منهم فَدَلَکَ بها وجهَهٗ وجِلْدَهٗ". (بخاری شریف ۳۷۹/۱)

مطلب یہ ہے کہ تم لات کے لعاب کو چوسو، ہم رسول اللہﷺ کے لعاب کو منہ پر لگاتے اور چوستے رہیں گے۔

یقول العبد الضعیف:

بلاشبہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہﷺ کا لعاب مبارک اور بلغم مبارک اپنے چہرے اور بدن پر ملتے تھے؛ لیکن رسول اللہﷺ کے ہونٹ مبارک سے نہیں چوستے تھے؛ بلکہ اپنی ہتھیلیوں میں لے کر پھر چہرے اور بدن پر ملتے تھے؛ لہٰذا حدیثِ بالا کو بنیاد بنا کر امصص بظر اللات کا مطلب ''تم لات کے لعاب کو چوسو'' نکالنا تکلف سے خالی نہیں۔

(۳) قولہ: عروہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر سب وشتم کا الزام نہیں لگایا، معلوم ہوا یہ گالی نہیں تھی۔

یقول العبد الضعیف:

صلح حدیبیہ والی اسی روایت میں معاً وارد ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے "امصص بظر اللات، أنحن نفرّ عنه و نَدَعُه" فرمایا، تو عروہ بن مسعود نے دریافت کیا کہ یہ (کلام کرنے والا) کون ہے؟ حاضرین نے کہا: ابوبکر ہیں۔ عروہ نے کہا: سنیے! اس ذات کی قسم، جس کے قبضہ میں میری جان ہے! اگر آپ کا احسان مجھ پر نہ ہوتا، جس کا میں اب تک آپ کو بدلہ نہیں دے سکا ہوں، تو ضرور آپ کو جواب دیتا۔

فَقَالَ لَهٗ أَبُوْبَکْرٍ: اِمْصَصْ بَظْرَ اللَّاتِ، أَنَحْنُ نَفِرُّ عَنْهُ وَنَدَعُهٗ؟ فَقَالَ: مَنْ ذَا؟ قَالُوْا: أَبُوْبَکْرٍ. قَالَ: أَمَا وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ، لَوْلَا یَدٌ کَانَتْ لَکَ عِنْدِیْ

لَمْ أَجْزِكَ بِهَا لَأَجَبْتُكَ. (صحیح بخاری، ص:۳۷۸، ج:۱، قدیمی: کراچی)

اس سے صاف معلوم ہوا کہ عروہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کلام: امصص بظر اللات سُنا اور اس کو اپنے محمل میں رکھا، یعنی جس قصد وارادہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ جملہ کہا تھا، عروہ نے اس کا مقصود، سب وشتم کو پالیا؛ لیکن دیت کی ادائیگی میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مکّی دور میں عروہ کی دس اونٹنیوں سے مدد کی تھی، اب تک وہ احسان اتار نہ سکنے کی وجہ سے عروہ نے اس کا جواب نہ دیا؛ بلکہ اس نے بقولِ خود صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی گالی کا جواب نہ دے کر احسان اتارا۔

اگر امصص بظر اللات سے سب وشتم مقصود نہ تھا اور عروہ نے اس کو سب وشتم کے معنی میں نہیں لیا تھا؛ بلکہ اس کا مطلب وہ تھا، جو مجیب محترم نے ذکر فرمایا ہے، تو احسان اتار نہ سکنا جواب دینے میں مانع کیوں کر ہوا؟

(۴) قوله: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اُسے اچھے معنی پر محمول کیا جائے۔

یقول العبد الضعیف:

ماقبل میں معلوم ہو چکا کہ جنگی حالات میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ قتال باللسان پر مشتمل کلام ہرگز ان کی شانِ صدیقیت کے خلاف نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

❁ ❁ ❁

تفسیر اور اصولِ تفسیر کی تدریس

از: مولانا اشتیاق احمد قاسمی
مدرس دارالعلوم دیوبند

قرآنِ کریم کتاب قرارت ہی نہیں کتابِ ہدایت بھی ہے، اس کی ہدایت کا دائرہ ساری انسانیت کو محیط ہے۔ (بقرہ:۱۸۵) اس میں پہلی امتوں کے (سبق آموز) واقعات ہیں، آئندہ رونما ہونے والے حوادث کی آگہی ہے، اور زمانۂ حال کے مسائل کا حل ہے، اس کی باتیں فیصلہ کن ہیں، یہ دل لگی کی باتیں نہیں ہیں، جو سرکش اسے چھوڑے گا اللہ تعالیٰ اس کو توڑ دیں گے اور جو قرآن کریم سے ہٹ کر ہدایت تلاش کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو گمراہ کردیں گے، یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے، یہ حکمت بھرا نصیحت نامہ ہے اور یہ سیدھا راستہ ہے۔ (ترمذی، باب فضائل قرآن، حدیث:۲۹۱۸)

قرآنِ کریم کے بعض مضامین تو بہت آسان ہیں، سب سمجھ سکتے ہیں، چند احکام صرف اہلِ علم ہی سمجھ سکتے ہیں، اور بعض مضامین اتنے اونچے ہیں کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ان کا علم ہے، مثلاً حروفِ مقطعات کا مفہوم۔

علامہ سیوطیؒ نے الاتقانی علوم القرآن (ص:۴۴۴) میں قرآن پاک کی آیتوں کے چار درجے بیان فرمائے ہیں:

۱- قرآن کی بعض آیات تو ایسی ہیں جن کو عرب محض عربی دانی کی وجہ سے سمجھ لیتے ہیں۔

۲- بعض آیات ایسی ہیں جن کا سمجھنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے، اور ہر ایک سمجھ بھی سکتا ہے۔

۳- بعض آیات کا مطلب صرف علماء ہی سمجھ سکتے ہیں، دوسرے کے بس کی بات نہیں۔

۴- بعض آیتوں کا مفہوم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔

تفسیر کے مراحل:

ہمارے مدارس میں قرآنِ پاک کی تفسیر تین مرحلوں میں پڑھائی جاتی ہے، پہلے ترجمۂ

قرآن مجید، پھر جلالین شریف پڑھائی جاتی ہے اور بالکل اخیر میں تکمیل تفسیر ہے، جسے دورۂ تفسیر یا تخصص فی التفسیر بھی کہا جاتا ہے۔

پہلا مرحلہ:

ہمارے نصاب کی خصوصیت ہے کہ قرآنِ پاک کا ترجمہ مکمل پڑھایا جاتا ہے، اس میں بھی تدریج ہے، پورے قرآنِ پاک کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

سوم عربی میں ترجمۂ قرآن مجید:

عربی سوم سے اس کی ابتداء ہوتی ہے؛ اس لیے کہ اس سے پہلے دوسالوں میں نحو، صرف اور عربی زبان کی ابتدائی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، سوم عربی میں وہ اس لائق ہوجاتے ہیں کہ ان کو قرآنِ پاک کا ترجمہ پڑھایا جائے، اگر طلبہ نحو، صرف اور عربی زبان میں کمزور ہوں تو انھیں ہرگز ترقی نہ دی جائے، یہ ان کے حق میں بہتر ہے، اس کے بہتر ہونے کا احساس ان کو دلایا جائے۔ اپنے یہاں کے مدارس میں عموماً اور دارالعلوم دیوبند میں خصوصاً سوم عربی کے طلبہ کو سورۂ ق سے اخیر قرآنِ کریم تک ترجمہ پڑھایا جاتا ہے؛ مگر ترجمہ، پارۂ عم سے شروع کیا جاتا ہے، جب یہ پارہ مکمل ہوجاتا ہے تو سورۂ ق سے ترجمہ شروع ہوتا ہے، پہلی ششماہی میں سوا پارہ یا ڈیڑھ پارہ ہی ترجمہ ہو پاتا ہے؛ چوں کہ شروع میں ترجمہ سے مناسبت نہیں ہوتی؛ اس لیے شروع میں اساتذہ دوچار آیتیں ہی پڑھائیں تو بہتر ہے، اور پڑھانے کا انداز یہ ہو کہ پہلے مشکل لغات لکھائے جائیں، لفظ کا مادّہ، صیغہ، واحد، جمع، تعلیل، تخفیف اور صلات وغیرہ بس اتنا ہی بیان کرنا چاہیے جتنے کی اس جگہ ضرورت ہو۔ پھر ترجمہ لفظی کرنا چاہیے؛ مگر نہایت ہی قدیم ترجمہ تحت اللفظ سے احتراز کرنا چاہیے۔ بعض اساتذہ حضرت تھانویؒ کا ترجمہ کرتے ہیں یہ بھی ٹھیک ہے؛ اس لیے کہ اس ترجمہ میں مضمون بھی واضح ہوجاتا ہے، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا ترجمہ بھی عمدہ ہے، پھر خلاصۂ تفسیر نہایت ہی اختصار کے ساتھ پیش کرنا چاہیے، اگر آیت کا سمجھنا شانِ نزول پر موقوف ہو تو اس کو ضرور بیان کرنا چاہیے، واقعات میں صحیح ترین واقعہ کو دیکھ کر اطمینان کر کے بیان کرنا چاہیے، ورنہ اسرائیلیات میں پڑنے کا شدید خطرہ باقی رہ جائے گا، جس آیت کی تفسیر میں مفسرین کے ایک سے زائد اقوال ہوں، ان میں سب سے راجح قول ہی طلبہ کو بتایا جائے؛ تاکہ اطمینان اور اعتماد کے

ساتھ یاد کرسکیں۔

کبھی چند اقوال بتادینے کا نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ طلبہ ایک قول بھی یاد نہیں کرتے ناچیز کو پہلے سال دارالعلوم دیوبند میں شرح مائۃ عامل پڑھاتے ہوئے یہ تجربہ ہوا، ایک جملہ کی دو ترکیبیں کردیں، طلبہ نے ایک بھی یاد نہ کی۔

سوم عربی میں بعض اساتذہ ترکیب میں زنجیری انداز اختیار کرتے ہیں، اور بعض صرف اعراب اور وجہ اعراب کے بیان کرنے پر اکتفار کرتے ہیں، اگر طلبہ کی نحوی استعداد پختہ ہے، شرح مائۃ عامل انھوں نے اچھی طرح پڑھی ہے تو صرف وجہِ اعراب بتادینا بھی کافی ہے، زنجیری ترکیب ضروری نہیں۔

دارالعلوم دیوبند میں عم پارہ میں ترکیب پر بہت زیادہ توجہ دی جاتی ہے اور سبق کی مقدار بہت کم رہتی ہے، پوری ششماہی میں صرف ایک سوا پارہ پر محنت مرکوز رہتی ہے، سورۂ ق سے مرسلات تک دوسری ششماہی میں پڑھاتے ہیں۔

چہارم عربی میں ترجمۂ قرآن مجید:

جب یہ طلبہ چہارم عربی میں آتے ہیں تو ان کو قرآن کی مشکل لغات، ترکیب اور خلاصہ یاد کرنے کا سلیقہ آجاتا ہے؛ اس لیے چہارم میں نصاب کی مقدار زیادہ ہوتی ہے، اور سورۂ یوسف سے سورۂ حجرات تک یہ ترجمہ پڑھتے ہیں، ان میں اکثر سورتیں مکی ہیں، مضامین مشکل نہیں ہیں؛ اس لیے ترجمہ، اعراب اور لغات پر زیادہ توجہ دینی چاہیے، یہاں بھی اندازِ بیان آسان اختیار کیا جائے، اور سوم عربی میں جن باتوں کا خیال کیا گیا ہے، ان کو ملحوظ رکھا جائے، لغات واعراب میں صرف اتنا ہی بتایا جائے جتنا ان کو ہضم ہوجائے، بعض اساتذہ اختصار کا خیال نہیں رکھتے ہیں؛ اس لیے ان کا درس بافیض نہیں ہوپاتا۔

مدنی سورتیں درج ذیل ہیں: حج، نور، احزاب، محمد، فتح اور حجرات ان میں احکام ہیں، آیات سے مستنبط ہونے والے احکام کو بھی نہایت ہی دقتِ نظر سے پڑھایا جائے۔

پنجم عربی میں ترجمۂ قرآن مجید:

پنجم عربی تک طلبہ کو ترجمۂ قرآن سے اچھی خاصی مناسبت ہوجاتی ہے، اس مرحلہ میں شروع

سے سورۂ ہود تک ترجمہ پڑھایا جاتا ہے، ان میں اکثر حصہ احکام ومسائل کا ہے؛ اس لیے مسائل اچھی طرح بیان کیے جائیں، جہاں اعراب مشکل ہو وہیں ترکیب بتائی جائے؛ البتہ لغات پر توجہ دینا یہاں بھی ضروری ہے۔

مسائل بتاتے ہوئے اساتذہ زیادہ طویل کلام نہ کریں، بس اتنے ہی مسائل بتائیں جو آیت سے مستنبط ہورہے ہوں، تفصیل ہدایہ کے لیے چھوڑ دیں، اگر کسی آیت کی چند تفسیریں ہوں تو راجح کو علت کے ساتھ بیان کردیں، لمبی تقریریں طلبہ کے لیے مفید نہیں ہوتیں۔

چہارم تک آیات میں ادب اور بلاغت ہرگز بیان نہ کریں، پنجم عربی میں دروس البلاغہ یا تلخیص المفتاح پڑھے ہوتے ہیں؛ اس لیے علم بیان، معانی اور بدیع کی مثالیں بیان کرنے میں بھی حرج نہیں۔

ترجمۂ قرآن دارالعلوم دیوبند کے طرز پر پڑھانا چاہیے:

دارالعلوم دیوبند کے طرز پر پورے قرآنِ پاک کا ترجمہ پڑھانا چاہیے اور نصاب کی تکمیل کا خیال رکھنا چاہیے، نصاب کا پورا نہ ہونا بہت بڑا عیب ہے، طلبہ میں تشنگی باقی رہ جاتی ہے، وہ زندگی بھر ختم نہیں ہوتی۔

تذکیری آیات کی تدریس:

آج کا ماحول فسق پسند ہے؛ ہر طرف گناہ اور گناہ کی طرف متوجہ کرنے والے اسباب کی بہتات ہے؛ اس لیے جن آیات میں اللہ رب العزت نے راست طور پر انسانی قلوب کو متوجہ کیا ہے، مختلف قسم کی ظاہری اور باطنی خرابی کو بیان کرکے ان سے بچنے کی تلقین کی ہے، ان آیات کو پڑھاتے وقت طلبہ کو باطن کی طرف متوجہ کرنا چاہیے، اس طرح امت کے نونہالوں کا تزکیہ ہوگا اور وہ امت کے لیے پاکیزہ قیادت کے علم بردار بن سکیں گے۔

تطبیق آیات:

آیاتِ قرآنی کا تعلق انسانی زندگی سے نہایت ہی قریب کا ہے، زندگی کی نشیب وفراز سے متعلق آیات موجود ہیں، ضرورت ہے کہ ان کو روزمرہ کی زندگی پر منطبق کیا جائے، بہت سی آیات واضح ہیں، ہمارے مدارس کے طلبہ کو برمحل آیات پڑھنے کی عادت نہیں ہوتی؛ اس لیے کبھی کبھار

اساتذہ طلبہ سے سوال کریں کہ فلاں بات سے متعلق آیت پڑھو؟ فلاں حکم کی آیت کون سی ہے؟ یہ بات پیش آئی ہے، اس سے متعلق کون سی آیت ہے؟ اس طرح طلبہ میں برجستہ آیات پڑھنے اور ان سے استدلال کی عادت ہوگی، حضرت مفتی سعید احمد پالن پوری زید مجدہ نے منتخب آیات واحادیث کے چھوٹے چھوٹے تین اجزاء محفوظات کے نام سے تیار کیے ہیں، ان کا مقصد بھی یہی ہے، ان سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ بہرکیف! تطبیق آیات کا ملکہ، مشق وتمرین سے ہی پیدا ہوتا ہے۔

دوسرا مرحلہ:

دوسرے مرحلہ میں عام طور سے ہمارے مدارس میں جلالین شریف پڑھائی جاتی ہے، اس مرحلہ میں طلبہ ایک حد تک قرآنِ کریم کے مضامین سے واقف ہوتے ہیں؛ اس لیے اساتذہ محض آیات کی تفہیمی تقریر نہ کریں؛ بلکہ پوری توجہ کتاب کے حل پر مرکوز رکھیں، جب کتاب ان کے قابو میں ہوگی تو تفصیل وہ خود ہی کرلیں گے، اس کتاب میں درج ذیل باتوں پر توجہ دی جائے:

۱- فوائدِ قیود: علامہ سیوطیؒ اور محلیؒ کے بڑھائے ہوئے الفاظ کی وجہ بتائی جائے، کہیں اعراب کی تعیین ہے، کہیں ترجمہ ہے، کہیں محذوف کی وضاحت ہے، کہیں تعلیل ہے، کہیں قراءتِ مشہورہ اور کہیں قراءتِ شاذہ کی وضاحت ہے، کہیں مسئلۂ شافعی کا بیان ہے، کہیں شانِ نزول ہے، کہیں قصہ ہے اور کہیں ناسخ ومنسوخ کی تعیین ہے۔

غرض یہ کہ جہاں جو بات بیان کی گئی ہے، استاذ صاحب کی ذمہ داری ہے کہ اسے حل کریں، اور طالب علم کو مطمئن کریں، جب تک اطمینان نہ ہو سبق نہ پڑھائیں، اور طلبہ کو ہر تفسیری اضافہ کی وجہ پوچھنے کی اجازت ہو، ان کے سوال پر ڈانٹا نہ جائے اور نہ الزامی جواب پر اکتفاء کیا جائے؛ بلکہ استاذ صاحب سوال کو سنجیدگی سے سنیں، اگر جواب مستحضر نہ ہو تو بعد میں جواب دینے کا وعدہ کریں اور مطالعہ کریں، اس موقع سے یہ خیال رہے کہ سوال کرنے والے طلبہ میرے علم میں اضافے کا سبب ہیں، ذہین طلبہ کی وجہ سے مطالعہ کی توفیق ہوتی ہے اور علم میں پختگی حاصل ہوتی ہے، جس طرح ہمارے اساتذہ نے ہمارے ساتھ ہمدردی کی ہے، ہمیں بھی طلبہ کے ساتھ ویسی ہی ہمدردی کرنی چاہیے، یونیورسٹیوں میں تحقیقی مقالات کی نگرانی کرنے والے پروفیسران کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اندازہ ہوا کہ وہ طلبہ کی الجھنوں کو نہایت ہی ہمدردی سے دور کرتے ہیں اور تحقیق میں طلبہ کا پورا تعاون کرتے ہیں؛ بلکہ عملی اشتراک سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

۲- راجح کی تعیین: علامہ سیوطیؒ اور محلیؒ نے جس تفسیر کو اختیار کیا ہے، وہ ہر جگہ راجح نہیں ہے، کہیں کہیں مرجوح بھی ہے، اس کی تعیین کی ذمہ داری استاذ کی ہے، انھیں پہلے اکابر علماء کی تفسیریں دیکھنی چاہئیں، پھر بڑی تفسیروں کی طرف رجوع کرنا چاہیے، مثلاً ابن کثیر، روح المعانی، مظہری اور مدارک وغیرہ، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دو یا چند اقوال میں سے ہر ایک درست ہوتے ہیں، ان میں فتویٰ کی طرح کسی ایک کو ترجیح دینے کی ضرورت نہیں۔

۳- اگر کوئی عقلی اعتراض ہو تو اس کے لیے تفاسیر کی طرف رجوع کرنا چاہیے، تفسیر کبیر بہت مفید ہے، اکثر عقلی اعتراضات اس میں حل ہو جاتے ہیں۔

۴- کہیں کہیں جلالین میں اسرائیلیات در آئی ہیں، ان کی نشاندہی بہت ضروری ہے، اس جگہ صحیح تفسیر کرنا، استاذ کی ذمہ داری ہے، اکابر علماء کی تفسیر کے ساتھ ابن کثیر کا دیکھنا بہت مفید ہوتا ہے، تفسیر بالروایہ میں ابن کثیر سب سے اہم تفسیر ہے۔

۵- شروع میں ہی طلبہ کو بتا دیا جائے کہ علامہ سیوطیؒ اور محلیؒ دونوں شافعی ہیں، آیات سے اپنے مسلک کے مطابق تفسیر اخذ کرتے ہیں، ان تمام مقامات پر سب سے پہلے شافعی مسلک کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کی جائے، اور اگر شوافع کی فقہی کتابیں میسر ہوں تو براہِ راست ان میں مسائل دیکھنے چاہئیں، پھر اپنے مسلک کی کتاب سے مسائل دیکھ کر بیان کیے جائیں، شوافع کے استدلال کا جواب دینا بھی ضروری ہے، ورنہ حنفی طلبہ کے ذہن میں اشکال باقی رہ جائے گا اور یہ بہتر نہیں۔

۶- جلالین کا حاشیہ بہت عمدہ ہے، اس کی عمدگی کا اعتراف بہت سے علماء نے کیا ہے؛ مگر حاشیہ لکھنے والے کون بزرگ ہیں؟ اس کا علم نہیں، انھوں نے محض اخلاص کی بنیاد پر اپنا نام تک نہیں لکھا؛ لیکن یہ بات طے ہے کہ وہ مسلکاً حنفی ہیں۔ تفسیر کے بہت سے اشکالات اچھی طرح حل کر دیتے ہیں؛ لیکن واقعات میں اسرائیلیات بھی خوب لیتے ہیں، اساتذہ کو ایسے مقامات پر بیدار مغزی سے کام لینا چاہیے، ان کی رو میں خود کو بہانا نہیں چاہیے۔

۷- جلالین میں قراءات بھی ہیں، قراءتِ مشہورہ کے ساتھ شاذّہ کو بھی ذکر کرتے ہیں، اساتذہ کو ذکر کردہ قراءت کو اچھی طرح تحقیق کر کے طلبہ کو بتانا چاہیے، اس کے لیے حاشیۃ الجمل کافی ہے، اس کے علاوہ السراج المنیر، روح المعانی، مظہری، وغیرہ کا دیکھنا بھی مفید ہے، ہر قراءت کے لحاظ سے آیت کی مختصر تفسیر ضرور کر دینی چاہیے؛ بلکہ لکھوا دینا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔

جلالین میں ایک مشکل یہ ہے کہ وہ قرارت میں ترتیب کا لحاظ نہیں کرتے ہیں، قرآنِ پاک کے رائج نسخہ میں جو آیت ہے، اس کی قرارت کبھی بعد میں اور دوسری قرارت پہلے لکھ دیتے ہیں، ایسی جگہوں پر طالبِ علم تشویش کا شکار رہتا ہے؛ اس لیے اساتذہ کو وضاحت کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔

جلالین میں ہر جگہ لہجات کو بیان نہیں کرتے ہیں؛ مگر جہاں دو ہمزہ جمع ہوجائیں ان کے لہجات ضرور لکھتے ہیں، ایسی جگہوں میں اساتذہ اگر قرارتِ سبعہ نہ پڑھے ہوں تو کوئی حرج نہیں، کسی جید قاری سے ادائیگی سیکھ لیں، پھر ادا کریں، محض عبارت دیکھ کر الٹا سیدھا ادا نہ کریں، یہ شرعاً جائز نہیں ہے۔

۸- ناسخ ومنسوخ کے بارے میں طلبہ کے ذہن میں شروع سے ہی یہ بات بٹھادینا ضروری ہے کہ قرآنِ پاک کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہے، پورا قرآن مجید محکم ہے، اپنے بزرگوں میں سے حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ کا یہی موقف ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا رجحان بھی یہی ہے، حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی عبارت سے سمجھ میں آتا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ اگر یک لخت کہہ دیتے کہ کوئی آیت منسوخ نہیں، تو لوگ نہ مانتے؛ اس لیے شاہ صاحبؒ قارئین کو تدریجاً اس نظریہ تک لے جانا چاہتے ہیں کہ موجودہ قرآن میں کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔ (الخیرالکثیر ص:۲۷۵)

الفوزالکبیر کی شرح میں حضرت مفتی سعیداحمد پالن پوری شیخ الحدیث وصدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند نے آیاتِ قرآنی کے محکم اور غیر منسوخ ہونے والے موقف کو اختیار فرمایا ہے، حضرت مفتی محمدامین صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند نے بھی الخیرالکثیر میں اسی موقف کی تائید کی ہے، اور جن آیتوں کو علماء نے منسوخ کہا ہے، ان سب کی ایسی واضح تفسیر کی ہے جس سے منسوخ نہ ہونے کا یقین ہوجاتا ہے۔

علامہ سیوطیؒ کے نزدیک اگرچہ اکیس آیتیں منسوخ ہیں؛ مگر جلالین میں ڈھیر ساری آیتوں کو منسوخ بتایا ہے، شاید متقدمین کے نظریہ کے مطابق ایسا کیا ہے؛ اس لیے پہلے اساتذہ نسخ کی بحث سمجھادیں، متقدمین اور متاخرین کی اصطلاح کا فرق بھی بتادیں اور ان جگہوں میں ایسی تفسیر کریں کہ طلبہ کا اشکال دور ہوجائے۔

۹- اسی مرحلہ میں یہ بھی بتادینا ضروری ہے کہ ہر آیت کا ''شانِ نزول'' ضروری نہیں، صرف انھیں آیتوں کا شانِ نزول جاننا ضروری ہے، جہاں بغیر شانِ نزول کے آیت کا سمجھنا مشکل ہو، مثلاً غزوۂ بدر وغیرہ کی آیات۔ (انفال ۴۲)

جلالین کے لیے معاون کتابیں:

قرآنِ پاک کے ترجمے اور اس کی تفسیریں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کو شمار نہیں کیا جا سکتا، ساری تفسیروں کا مطالعہ ممکن نہیں؛ جب دارالعلوم حیدرآباد میں راقم الحروف سے کتابیں متعلق ہوئیں تو جلالین شریف کے علاوہ کوئی کتاب ایسی نہیں تھی، جس میں جی لگتا، میں نے مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری زید مجدہ کو فون پر بتایا کہ ساری کتابیں اوّل، دوم اور سوم کی ہیں، صرف ایک جلالین مطالعہ کے لائق ہے، میں کیا کروں؟ جی نہیں لگ رہا ہے، حضرت نے برجستہ فرمایا کہ یہ تو بہت اچھا موقع ہے کہ قرآن مجید سے مناسبت پیدا ہو جائے گی اور یہ بہت بڑی نعمت ہے، تم اس کی متعلقات کتب خانہ سے نکال کر ذوق وشوق سے مطالعہ شروع کر دو، جی لگنے لگے گا، میں کتب خانہ گیا اور ترسٹھ کتابیں نکال لایا، وہاں کسی سے کوئی تعلق نہیں تھا، کمرے میں بیٹھا پڑھتا رہتا تھا، مختلف ذوق رکھنے والے مفسرین کی کتابیں دیکھتا تھا؛ لیکن ہدایت کے مطابق طلبہ کے لیے باتیں ترتیب دے کر جاتا، عبارت سے متعلق بس ضروری باتیں ہی بیان کرتا تھا؛ اس طرح ذی الحجہ کا مہینہ آ گیا، اور دیوبند آنا ہوا، یہاں حضرت مفتی صاحب سے پوچھا کہ تفسیر کی کتابیں تو بے شمار ہیں، مجھے جلالین کے لیے کون کون سی کتابیں دیکھنی چاہئیں، فرمایا ''حاشیۃ الجمل'' سے جلالین حل کیا کرو پھر اپنے کسی بزرگ کی تفسیر دیکھ لیا کرو، اتنا کافی ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ جلالین کی مشکلات حاشیۃ الجمل میں حل ہو جاتی ہیں، صاوی بھی جمل کے شاگرد ہیں، اس میں جمل کا اختصار ہے، بار بار کے مقابلے سے میں نے یہ سمجھا ہے، کہا جاتا ہے کہ صاوی بدعتی ہیں، ان کے حوالے سے متعدد بدعات کتابوں میں ذکر کی گئی ہیں۔ راقم الحروف ان کے ساتھ علامہ شوکانی کی فتح القدیر، زمخشری کی کشاف اور خطیب کی سراج منیر کے ساتھ خازن اور مدارک بھی دیکھتا تھا اور استفادہ کرتا تھا، قرآن مجید کے اردو تراجم میں جتنے تراجم میسر ہوئے، سب کو اس لیے دیکھا کہ ایک تقابلی نظر ہو جائے، اس دوران بہت سوں سے عقیدت بڑھی اور بہت سوں سے بدگمان ہو گیا۔

جلالین کے لیے اردو شروحات دیکھنے کی نوبت نہیں آئی؛ البتہ دو تین مرتبہ مشکل مقام پر ''کمالین'' کو اٹھایا، اتفاق سے دو جگہ ترجمہ بھی نہیں کیا گیا تھا، اور ایک جگہ ترجمہ تو تھا؛ مگر اس سے عبارت حل ہوتی ہوئی نظر نہ آئی، اس کے بعد سے کبھی نہ دیکھا، ''جمالین'' اس وقت طبع ہوئی جب

چار پانچ سال جلالین پڑھا چکا تھا؛ اس سے استفادہ کا موقع نہیں ملا؛ البتہ ایک بار تعارف لکھنے کے لیے دیکھا، بہ ظاہر اچھی شرح معلوم ہوتی ہے، ایسا لگتا ہے کہ شارح نے کتاب کے حل کرنے میں بڑی عرق ریزی کی ہے۔

تفسیر کی منتخب کتابیں:

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی نے عربی تفاسیر کی پانچ کتابوں کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر کوئی ان کو دیکھ لے تو ان شاء اللہ کسی اور کے دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، وہ کتابیں درج ذیل ہیں:

۱- تفسیر ابن کثیر ۲- تفسیر کبیر ۳- تفسیر أبی سعود
۴- تفسیر قرطبی ۵- روح المعانی

''ابن کثیر'' تفسیر بالروایہ میں لاجواب ہے، یہ احادیث صحیحہ، ضعیفہ اور موضوعہ کی تعیین کردیتے ہیں، اسرائیلیات میں بہت محتاط ہیں۔

''تفسیر کبیر'' میں امام رازیؒ نے نہایت ہی بسط وتفصیل سے کلام کیا ہے، اس میں احکام شرعیہ کا بیان ہے، فرقِ باطلہ کی تردید ہے، ربط آیات کو بھی نہایت ہی بے تکلف بیان فرماتے ہیں، اس تفسیر میں تفسیری اشکالات حل ہوجاتے ہیں، ہاں! یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس میں رطب ویابس روایات بھی خوب ہیں؛ چوں کہ واعظ تھے؛ اس لیے روایات میں غَضِّ بصر سے کام لیا ہے۔

''تفسیر ابی سعود'' کے مطالعہ کی رہنمائی مجھ کو حضرت الاستاذ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مدظلہ استاذ حدیث، مدیر ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند نے کی، یہ تفسیر بھی نہایت عمدہ ہے، مختصر ہے، اس میں ربط آیات، فقہی احکام، ادب اور بلاغت بہت سی چیزیں قارئین کے لیے کشش کا باعث ہیں۔

''تفسیر قرطبی'' بھی کافی عمدہ ہے، اس میں روزمرہ کی ہدایات، تذکیری آیات پر کافی تفصیلی گفتگو ملتی ہے، مشکل الفاظ کو حل کیا ہے، اعراب کی تعیین بھی کی ہے۔

''روح المعانی'' کے لیے بس اتنا کہنا کافی ہے کہ اس میں متقدمین کی جملہ تفاسیر کا عطر اکٹھا کیا گیا ہے، اسلامی کتب خانوں میں اس سے عمدہ تفسیر موجود نہیں، لغت، نحو، صرف، قرارت، بلاغت، فقہ، عقائد، فلسفہ، ہیأت اور تصوف ہر چیز کو بیان کیا ہے، روایات میں بہت محتاط ہیں، بعد کے سارے مفسرین ان کے خوشہ چیں ہیں۔

تیسرا مرحلہ:

اس مرحلہ کو تکمیل تفسیر، تخصص فی التفسیر اور دورۂ تفسیر بھی کہتے ہیں، ہندوستان کے سارے مدارس کا حال تو مجھے معلوم نہیں، صرف دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم حیدرآباد کو قریب سے دیکھنے اور برتنے کا موقع ملا ہے، دارالعلوم دیوبند میں دو تفسیر اور ایک اصولِ تفسیر کی کتاب داخلِ نصاب ہے، ابن کثیر میں سورۂ صافات اور ستائیسواں پارہ مکمل پڑھاتے ہیں، بیضاوی میں سورۂ آل عمران مکمل اور سورۂ فاتحہ کے ساتھ سورۂ بقرہ آدھ پارہ داخل نصاب ہے، اساتذۂ کرام ان دونوں تفسیروں کو سبقاً سبقاً پڑھاتے ہیں، عملی کوئی کام نہیں لیا جاتا؛ اس لیے یہ درجہ بہت فعال نہیں ہے۔

دارالعلوم حیدرآباد میں تخصص فی التفسیر کا شعبہ کھلا، اس میں تفسیر کی درج ذیل کتابیں داخلِ نصاب کی گئیں: مختصر ابن کثیر، فتح القدیر للشوکانی، تفسیراتِ احمدیہ، تاویل مشکل القرآن لابن قتیبہ، مشکلات القرآن علامہ کشمیریؒ، مناہل العرفان۔

وہاں مختلف انداز سے لکھنے کا کام بھی لیا جاتا تھا، مثلاً آیاتِ احکام کی تخریج کرائی جاتی تھی اور راست طور پر قرآن مجید سے کتنا حکم مستنبط ہوتا ہے، اس کی تفصیل معاون کتابوں سے طلبہ لکھتے تھے، بیان القرآن کا مطالعہ لازم تھا، متعدد عناوین پر طلبہ سے مقالے لکھوائے جاتے تھے، راقم الحروف سے متعلق مناہل العرفان تھی، دارالعلوم دیوبند کے نصاب کے مطابق تین مباحث پڑھائے اور ان سے متعلق نوٹس لکھوائے جاتے تھے؛ لیکن مشکل یہ پیش آئی کہ تفسیر کے لیے اچھے طلبہ نہیں ملتے تھے، اکثر اچھی استعداد والے یا تو افتاء پڑھتے ہیں یا عربی زبان وادب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اس کی وجہ سے حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ لکھتے ہیں:

''دورۂ تفسیر فراغت کے بعد پڑھایا جاتا ہے؛ اس لیے جو طلبہ پڑھنا چاہتے بھی ہیں، ان کو ان کے سرپرست موقع نہیں دیتے، وہ کہتے ہیں کہ تم فارغ ہوگئے اب پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ کام میں لگو! پھر ایسے کام میں لگتے ہیں کہ از خود مطالعہ بھی نہیں کرتے''۔ (الخیر الکثیر، ص:۲۰)

دورۂ تفسیر کا طریقۂ کار:

حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری زید مجدہ لکھتے ہیں:

''دورۂ تفسیر جس میں بیضاوی، ابن کثیر اور مظہری کی مدد سے قرآنِ کریم کی مکمل تفسیر پڑھائی جاتی ہے، یہ دورۂ تفسیر کچھ کامیاب نہیں، اور ناکامی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ تفاسیر اتنی

طویل ہیں کہ ان کے پانچ پانچ پارے بھی ایک ایک گھنٹہ میں کماحقہ نہیں پڑھائے جاسکتے، علاوہ ازیں ذی استعداد طلبہ ازخود ان کا مطالعہ کرسکتے ہیں، انھیں ایک سال لگانے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر دورۂ حدیث عمدۃ القاری، فتح الملہم، بذل المجہود اور معارف السنن کی مدد سے پڑھایا جائے، یعنی متونِ حدیث پڑھانے کے بجائے یہ شروح پڑھائی جائیں تو دورۂ حدیث کا رنگ بھی پھیکا پڑجائے گا''۔

آگے لکھتے ہیں:

''دورۂ تفسیر میں بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ متن قرآن کریم کو بنیاد بنا کر شیخ الحدیث اور اساتذۂ حدیث شریف کی طرح متخصصینِ تفسیر، قرآن کریم کا درس دیں، اور تمام تفاسیر سے استفادہ کریں اور خلاصہ بیان کریں تو دورۂ تفسیر کی شان پیدا ہوسکتی ہے''۔ (الخیرالکثیر ص:۱۹)

اس کے ساتھ اگر مشورے سے کچھ عملی کام کا اضافہ کرلیا جائے تو بہت بہتر رہے گا۔

قرآنِ کریم سے بے توجہی:

دیکھا جائے تو ہمارے مدارس میں ترجمۂ قرآن ہی پر توجہ ہے، سوم، چہارم اور پنجم عربی میں اردو ترجمہ اور جلالین کے ذریعہ عربی ترجمہ پڑھایا جاتا ہے اور بس، چند ہی مدارس میں تخصص ہے، اور وہ بھی غیر فعال، قرآنِ پاک کی حیثیت ایک مظلوم صحیفہ کی سی ہوگئی ہے، یہ کتاب جتنی توجہ کی مستحق ہے ہم اتنی توجہ نہیں دے رہے ہیں، ضرورت ہے کہ مدارس کے سرکردہ حضرات سر جوڑ کر بیٹھیں اور تفسیر قرآن کا ایک مفید نصاب اور مؤثر طریقۂ کار اپنائیں!

الحمدللہ! آج حفاظ کی کمی نہیں ہے، اگر کمی ہے تو قرآنِ کریم کو صحیح سمجھ کر عمل کرنے اور عام کرنے کی، اگر قرآنِ کریم پر ہم عمل پیرا رہے تو ہمیں ضرور بالضرور عزت ورِفعت ملے گی، وباللہ التوفیق!

اصولِ تفسیر کی تدریس:

''اصولِ تفسیر'' میں تفسیر قرآن سے متعلق قواعد اور قوانین بیان کیے جاتے ہیں، اس موضوع کی دو کتابیں ہمارے یہاں داخل نصاب ہیں:

(۱) الفوز الکبیر (۲) مناہل العرفان

الحمدللہ! دونوں کتابوں کو کئی بار پڑھانے کا موقع ملا، الفوز الکبیر بڑی مفید کتاب ہے، اس

میں فہم قرآن میں پیش آنے والے مشکلات کو نہایت ہی اچھے انداز سے حل کیا گیا ہے، مختصر سی کتاب میں اتنے اصول وضوابط بیان کیے گئے ہیں کہ کوئی اور کتاب اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی، بہ قول حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ:

''یہ ایک قیمتی اور نادر بیاض ہے، اس کی قدر وہی لوگ جان سکتے ہیں، جن کو ان مشکلات سے واسطہ پڑا ہو، بعض بعض اصول جو شاہ صاحبؒ نے اپنے ذوق ووجدان اور فہم قرآن کی بناء پر لکھ دیے ہیں، دوسری کتابوں کے سیکڑوں صفحات کے مطالعہ سے بھی حاصل نہیں ہوسکتے''۔

(الفرقان بریلی شاہ ولی اللہ صاحبؒ نمبر، ص:۳۴۱)

اگر یہ کہا جائے کہ ہمارے یہاں صرف یہی ایک کتاب پڑھائی جاتی ہے، تو بھی بے جا نہ ہوگا؛ اس لیے کہ تخصص فی التفسیر چند ہی مدارس میں ہے اور اس میں داخل ہونے والے طلبہ بھی بہت کم ہوتے ہیں۔

پھر اس کتاب کے ساتھ سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ اسے سال کے اخیر میں پڑھاتے ہیں، اور وہ بھی رواروی میں اس طرح کہ طلبہ اس کو کماحقہ سمجھ نہیں پاتے، وہ سالانہ امتحان کی تیاری میں مصروف رہتے ہیں اور جلالین پڑھانے کے بعد پڑھائی جاتی ہے؛ اس لیے اس کا کوئی فائدہ طالب علم پر مرتب نہیں ہوتا۔

دارالعلوم دیوبند کے اربابِ انتظام نے اس پر توجہ دی اور ۱۴۱۷ھ سے سال کے شروع میں پڑھائی جانے لگی، اور اس کا گھنٹہ مستقل کردیا گیا؛ تاکہ طلبہ گہرائی کے ساتھ پڑھیں اور قرآنِ کریم کے اصول سے اچھی طرح واقف ہوں، دارالعلوم کا یہ اقدام بہت مفید ثابت ہوا۔

(الخیر الکثیر، ص:۲۴۰)

دارالعلوم حیدرآباد میں جب یہ مجھ سے متعلق ہوئی تو میں نے ذمہ داروں سے اجازت لے کر سال کے شروع میں پڑھانا شروع کیا۔

''الفوز الکبیر'' کو سرسری طور پر نہ پڑھایا جائے، کسی بھی اصول کی کتاب کو سرسری طور پر پڑھانا فائدہ مند نہیں ہوتا، اہم ترین کام ان اصولوں کا اجراء ہے، اس میں سب سے بنیادی چیز قرآنی آیات کی زُمرہ بندی ہے، شاہ صاحبؒ نے پانچ قسموں میں زمرہ بندی کی ہے: (۱) احکام (۲) جدل (۳) تذکیر نعمت (۴) تذکیر واقعات (۵) تذکیر موت وآخرت۔

الفوز الکبیر اور جلالین ایک استاذ سے متعلق ہونی چاہیے، اس کے بغیر فائدہ کم ہوگا، جب

الفوزالکبیر ختم ہوجائے، اور جلالین شروع ہوتو استاذ صاحب نشاندہی کریں کہ یہ فلاں قسم کی آیت ہے اور یہ فلاں قسم کی، پھر اس کے مطابق تشریح کریں، مثلاً احکام کی آیت میں بتائیں کہ اس میں یہ حکم بیان ہوا ہے، اس کا اتنا جز، قرآن میں ہے، اتنا حدیث اور اجماع میں وغیرہ۔

جدل کی آیتوں میں بھی بتائے کہ مشرکین، منافقین، یہود ونصاریٰ کی فلاں خرابی اس جگہ ہے، اور فلاں خرابی یہاں، ان کے استدلال کا اسلوب قرآن نے کیا اختیار کیا ہے؟

الفوزالکبیر میں اسباب نزول کی بحث بھی بہت اہم ہے، اس کو تھوڑا تھوڑا نہایت ہی امعان وگہرائی سے پڑھانا ضروری ہے۔

بہتر یہ ہے کہ ہر فصل کے بعد طلبہ کا آموختہ سنا جائے اور ان سے سوالات کیے جائیں؛ تاکہ اندازہ ہوجائے کہ انھوں نے اچھی طرح سمجھا ہے یا نہیں۔

الفوزالکبیر کے بعد تخصص فی التفسیر میں ''مناہل العرفان'' پڑھائی جاتی ہے، یہ علامہ محمد عبدالعظیم زرقانیؒ کے محاضرات کا مجموعہ ہے، جوانھوں نے جامع ازہر میں طلبہ کے سامنے پیش کیے ہیں، یہ درسی کتاب کی طرح نہیں ہے، طول بیانی بہت زیادہ ہے، کبھی کبھی پڑھتے پڑھتے طبیعت اُکتا جاتی ہے؛ مگر بہت مفید ہے، اس کے تین مباحث دارالعلوم دیوبند میں پڑھائے جاتے ہیں۔

اس کتاب کو اگر اساتذہ سبقاً سبقاً نہ پڑھائیں؛ بلکہ طالب علم خود پڑھے اور ہر مبحث کا خلاصہ لکھے اور پھر ان کو اپنی زبان سے بیان کرے تو اس کا فائدہ دوچند ہوسکتا ہے۔ اصولِ تفسیر پڑھانے والے اساتذہ کو الاتقان، البرہان اور التبیان وغیرہ کو مطالعہ میں رکھنا چاہیے۔

قیمتی نصیحت:

میں نے اس موضوع پر تیاری کرنے سے پہلے حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری زیدمجدہ سے دریافت کیا کہ ''تفسیر قرآن کی تدریس'' سے متعلق کچھ بتادیجیے! انھوں نے تھوڑی دیر خاموش رہ کر جواب دیا کہ اس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ اساتذہ نے اپنے اساتذہ سے جس طرح پڑھا ہے، اسی طرح پڑھائیں، جس استاذ کو جس کا اسلوب پسند ہو اسی کو اختیار کرے، پھر فرمایا کہ سبق میں مرجوح اقوال بیان نہ کیے جائیں اور راجح کی تعیین کے لیے اکابر کی تفسیر کو معیار بنایا جائے۔ استعدادسازی کے لیے سب سے بہتر تو یہ ہے کہ طالب علم کتاب خود حل کرے، اور استاذ کے سامنے پڑھے، اگر صحیح ہوتو استاذ کہے: ''ہوں'' اور غلط ہوتو کہے ''اُوں ہوں'' اور درس گاہ میں

طلبہ اتنے ہوں جہاں تک استاذ کی قیمتی پہنچ جائے۔

مساجد میں درس قرآن:

قرآن مجید کتاب قرارت بھی ہے اور کتابِ ہدایت بھی؛ لیکن آج ہم نے اس کو صرف کتاب قرارت بنالیا ہے؛ حالاں کہ علمائے امت نے قرآن پاک کا ترجمہ خصوصاً عوام کے لیے کیا ہے، جب زبان فارسی تھی تو سب سے پہلے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے فارسی میں ترجمہ کیا، پھر ان کے صاحب زادوں نے اردو زبان میں ترجمہ کیا، حضرت شیخ الہندؒ نے شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے ترجمہ کو اپنے زمانہ کی اردو زبان میں مہذب کیا، اس پر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے تفسیری حاشیہ لکھا، یہ سب عوام کے لیے کیا گیا؛ اس لیے عوام کو قرآن پاک کے یہ ترجمے پڑھنے چاہئیں، مسلمانوں کے مصائب وآلام اور ذلت وپستی کے من جملہ اسباب میں سے ایک قرآنِ پاک سے دوری ہے، حضرت شیخ الہندؒ جب مالٹا سے دیوبند تشریف لائے تو علماء کے درمیان ارشاد فرمایا:

''میں مالٹا کی جیل سے یہ سبق لے کر آیا ہوں کہ اپنی پوری توانائی دو کاموں میں صرف کرنا ہے، ایک تو قرآن کو گاؤں گاؤں، محلے محلے اور گھر گھر عام کرنا ہے کہ کم از کم اس کی لفظی تعلیم سے کوئی مرد وعورت، بچہ بوڑھا خالی نہ رہے، اور بڑی مسجدوں میں ''درسِ قرآن'' جاری کیے جائیں، جن میں آسان تفسیر قرآن عوام کو پڑھائی جائے، دوسرے آپس کی لڑائی جھگڑوں کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔'' (الخیرالکثیر، ص: ۱۸)

آج ضرورت ہے کہ ''درسِ قرآن'' کے ذریعہ عام مسلمانوں کو قرآنی مضامین سے واقف کرایا جائے، خاص طور سے جو آیتیں تذکیری پہلو رکھتی ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی یاددہانی اور آفاق وانفس میں غور وتدبر والی آیتیں، انبیائے کرامؑ کے واقعات، نافرمانوں کو سزا دیے جانے کے واقعات، عام نصیحت کی آیتیں، سبق آموز عبرت وموعظت سے عام مسلمانوں کو آگاہ کیا جائے، دنیا کے فنا ہوجانے اور آخرت کے ہمیشہ باقی رہنے، قبر، حشر، جنت اور جہنم کی آیات کے معانی سے ان کو آگاہ کیا جائے، موت اور اس کے بعد جزا وسزا کا استحضار کرایا جائے۔

اگر مساجد میں ''درسِ قرآن'' کی مجلسیں ہونے لگیں تو عوام علماء سے قریب ہوں گے، زندگی شریعت کے مطابق گزارنے کا حوصلہ پیدا ہوگا، قرآن پر امت متفق ہوگی، اس کی نورانیت

سے معاشرہ روشن ومنور ہوگا۔

قرآن کے الفاظ:

قرآنِ پاک میں الفاظ اکثر وہی ہیں جو ہم اردو میں بولتے ہیں، مثلاً سورۂ فاتحہ میں: حمد، رب، عالم، رحمٰن، رحیم، مالک، عبادت، ہدایت اور صراطِ مستقیم جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، صیغے اور انداز کا فرق ہے، اگر ہم عوام کو ہر ہر لفظ کا ترجمہ بتا کر روزانہ یا ہفتہ میں ایک دو آیت پڑھادیا کریں تو دھیرے دھیرے لوگ الفاظِ قرآنی سے قریب ہوجائیں گے، کہا جاتا ہے کہ قرآنِ پاک میں الفاظ دو ہزار کے قریب استعمال ہوئے ہیں، ان میں تقریباً پندرہ سو الفاظ ہم روزمرہ بول چال میں استعمال کرتے ہیں؛ اس لیے بقیہ الفاظ کو سیکھنا بھی کچھ بعید نہیں، کرنے سے کام آسان ہوتا ہے۔

درسِ قرآن کا انداز:

''درسِ قرآن'' کا اسلوب نہایت آسان اور سہل رکھا جائے، جس سے عام لوگ مانوس ہوں، الفاظ بھی بالکل عوامی استعمال کریں، موٹے موٹے عقائد، بدعات ورسوم سے اجتناب، معاشرہ کی اصلاح، اعمالِ صالحہ کی ترغیب، اچھے اخلاق کی تلقین اس انداز سے کی جائے جو قبولِ عام حاصل کرسکے۔

آج کل لوگوں کی مصروفیت بہت بڑھ گئی ہے؛ اس لیے پندرہ بیس منٹ سے زیادہ وقت نہ لیا جائے، مشورہ سے ایسا وقت متعین کیا جائے جس میں سب کو سہولت ہو۔

جو اردو جانتے ہوں ان کو اردو ترجمہ وتفسیر مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا جائے، مثلاً حضرت تھانویؒ کا ترجمہ، معارف القرآن، ترجمہ شیخ الہندؒ، مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ کی ہدایت القرآن، مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ کی توضیح القرآن وغیرہ اور جو ہندی اور انگریزی جانتے ہوں، ان کو ایسے ترجمے مہیا کیے جائیں، اور تاکید کی جائے کہ قرآن میں اپنی رائے نہ چلائیں، ہاں جو باتیں سمجھ میں نہ آئیں، انھیں صحیح فکر کے حامل علماء سے پوچھیں، اس طرح عام مسلمان قرآن سے قریب ہوں گے، اور ان کی زندگی کے لیے قرآنِ پاک کتابِ ہدایت ثابت ہوگی۔

❁ ❁ ❁

مہر اور جہیز کی بے اعتدالیاں

از: مولانا محمد انعام الحق قاسمی
ریاض، سعودی عرب

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے: ﴿اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَبِمَا اَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ﴾ (سورۃ النساء: ۳۴) مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے کہ مردوں نے اپنا مال خرچ کیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ﴿إِنِّي لَأَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهُ لٰكِنِّي أَصُوْمُ وَأُفْطِرُ وَأُصَلِّي وَ أَرْقُدُ وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي﴾ (رواہ البخاری ومسلم) ترجمہ: میں تم لوگوں کے مقابلے میں اللہ سے ڈر اور تقوی میں بہت آگے ہوں؛ لیکن میں روزہ رکھتا ہوں، افطار کرتا ہوں، نماز پڑھتا ہوں، سوتا ہوں اور عورتوں سے شادی کرتا ہوں، پس جو کوئی بھی میری سنت سے منہ موڑے وہ مجھ میں سے نہیں ہے۔

مہر کی شرعی حقیقت:

ارشاد باری ہے ﴿وَآتُوا النِّسَآءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً﴾ (سورۃ النساء: ۴) اور عورتوں کے مہر بخوشی ادا کردیا کرو۔ ﴿فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً﴾ (النساء: ۲۴) پس جو لطف تم نے ان سے اٹھایا ہے اس کے بدلے ان کے مہر کو ایک فرض کے طور پر ادا کرو۔ حدیث میں ہے کہ جس نے کسی عورت سے نکاح کیا اور نیت یہ رکھی کہ مہر دینا نہیں ہے تو وہ زانی ہے اور جو مہر ادا کیے بغیر مرجائے وہ قیامت کے دن زانیوں کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ مقدارِ مہر کی تعیین میں بے اعتدالی نہ برتی جائے اس کی مقدار اتنی ہو کہ مرد بہ آسانی بغیر قرض لیے اسے ادا کردے ﴿لَا تَغْلُوْا فِيْ مُهُوْرِ النِّسَآءِ لِتَكُوْنَ عَدَاوَةً﴾ (مسند احمد) عورتوں کے مہر کے معاملے میں اتنا غلو نہ کرو کہ عداوت کا سبب بن جائے۔ حضرت عائشہ آنحضرت ﷺ سے روایت کرتی ہیں ﴿اِنَّ اَعْظَمَ النِّسَاءِ بَرَكَةً أَيْسَرُهُنَّ صَدَاقاً﴾ (مسند احمد، بیہقی) سب سے زیادہ برکت والی

خاتون وہ ہے جس کا مہر سہل اور آسان ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ زیادتی مہر کے بہت خلاف تھے مہر کی زیادتی نہ عزت وشرف کی چیز ہوتی ہے، نہ ہی اللہ کے نزدیک تقوی و پرہیز گاری کا عمل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بارہ اوقیہ سے زیادہ کسی بیوی یا بیٹی کا مہر مقرر نہیں فرمایا۔ سوائے ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے جن کے مہر کو نجاشی نے طے کیا تھا۔ اور اسے حضور ﷺ کی طرف سے ہدیہ کے طور پر ادا کر دیا تھا۔

قرآن کریم اور رسول اللہ ﷺ کے عمل سے یہ صراحتاً ثابت ہے کہ مہر محض عورت کا حق ہے اور اسے نکاح کے بعد ادا کرنا فرض ہے، اگر یہ باقی رہ گیا تو یہ ایک قرض ہے جس کا ادا کرنا فرض ہوگا۔ جو معاف نہیں کیا جاسکتا یہاں تک کہ ایک حدیث کے مطابق قرض رکھنے والے شہید کو بھی معافی نہیں ہے۔ مہر کی ادائیگی میں اصل جلد از جلد ادا کرنا ہے۔ مہر کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا کہ مہر کی مقدار اتنی زیادہ مقرر کر دی جائے کہ مرد کبھی بھی اپنی عورت کو طلاق دینے کی ہمت نہ کر سکے اور خدانخواستہ اگر طلاق دیتا ہے تو بطور جرمانہ اسے یہ بھاری بھرکم رقم ادا کرنی پڑیگی، یہ قرآن کریم اور احادیث کی روح کے بالکل خلاف ہے۔

جہیز کی شرعی حقیقت:

رسول اللہ ﷺ نے اپنی لاڈلی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کو چار چیزیں عنایت فرمائی تھیں، جیسا کہ صحیح احادیث میں ہے ﴿اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ لَمَّا زَوَّجَ فَاطِمَۃَ بَعَثَ مَعَھَا بِخَمِیْلَۃٍ وَ وِسَادَۃٍ مِنْ أَدَمٍ حَشْوُھَا لِیْفٌ وَ رَحَیَیْنِ وَسِقَاءً وَجَرَّتَیْنِ﴾ (مسند احمد، الحاکم، والنسائی) رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت فاطمہؓ کا نکاح کیا تو ان کے ساتھ ایک مخملی چادر، چمڑے کا تکیہ جس کے اندر کھجور کی چھال بھری تھی، دو چکیاں، ایک مشکیزہ اور دو چھوٹے گھڑے۔ جہاں تک معاملہ اس کے سنت ہونے کا ہے تو کسی طور پر اسے سنت کہنا درست نہیں ہے؛ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی دو بیٹیوں حضرت رقیہ اور ام کلثومؓ کو حضرت عثمانؓ کے نکاح میں دیا تھا اور ان دونوں کو کوئی جہیز دینا احادیث میں وارد نہیں ہے؛ البتہ حضرت خدیجہؓ کا ہار حضرت زینبؓ کو دینا احادیث میں آتا ہے، اگر جہیز دینا سنت ہوتا تو آپ ﷺ اپنی تمام بیٹیوں کو بلاتفریق جہیز سے نوازتے۔ حضرت علیؓ کے نکاح کے وقت نہ آپؓ کا اپنا کوئی ذاتی گھر تھا اور نہ ہی کوئی ساز وسامان۔ جب آپؓ کے نکاح کی خبر حضرت حارث بن نعمانؓ نے سنی تو بخوشی اپنی سعادت سمجھتے ہوئے، اپنا ایک گھر حضرت علیؓ کو رہنے کے لیے پیش کر دیا۔ حضرت علیؓ اور فاطمہؓ دونوں آپ ﷺ کی کفالت میں تھے۔ عبداللہ

بن عباسؓ، حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے فاطمہؓ کا نکاح فرمایا تو میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے میری بیوی کے پاس جانے کی اجازت دیجیے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: هل عندك شيء تعطيها؟ اسے مہر میں دینے کے لیے تمہارے پاس کچھ ہے۔ میں نے عرض کیا: جی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہاری حطمیہ زرہ کہاں ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میرے پاس ہے، تو فرمایا وہ اسے مہر میں دے دو (رواہ احمد، ابوداود، بیہقی) حضرت علیؓ نے اپنی زرہ حضرت عثمانؓ سے ۴۸۰ درہم میں فروخت کردی اور جاتے وقت حضرت عثمانؓ نے وہ زرہ حضرت علیؓ کو ازراہِ محبت تحفے میں مرحمت کردی۔ اسی زرہ کے پیسے سے حضرت فاطمہؓ کے گھر گرہستی کا سامان خریدا اور حضرت عائشہ اور ام سلمہؓ کو حکم دیا کہ حضرت علی اور فاطمہؓ کے ساتھ ان کے گھر تک جاؤ۔ اس حدیث سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ سارے سامان حضرت علیؓ کے پیسے سے خریدے گئے تھے، نہ کہ آپ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کو جہیز میں دیا تھا اس کو جہیز لینے اور دینے کے لیے کسی طرح حجت نہیں بنایا جاسکتا ہے۔ جو لوگ داماد اور اس کے گھر والوں کو بغیر مطالبہ کے اپنی استطاعت کے مطابق بیٹی کو جو سامان دیتے ہیں وہ تحفہ اور ہدیہ ہے۔ مہر کے ساتھ جہیز میں دیے گئے تمام سامان کی مالک لڑکی ہے، اسے بلاشرکت غیر تصرف کا حق ہے۔

جہیز کی سماجی تباہ کاریاں:

آج ہمارا معاشرہ طرح طرح کی برائیوں کی آماجگاہ بنتا جارہا ہے۔ جس کی وجہ سے امن وسکون، انسانیت، رواداری، انسان دوستی، آپسی الفت ومحبت اور بھائی چارگی کی لازوال دولت رخصت ہوتی جارہی ہے۔ آج ہمارے سماج کو جن داخلی برائیوں کا سب سے بڑا چیلنج ہے، ان میں سے ایک ''جہیز کی لعنت'' بھی ہے۔ جہیز ایک خطرناک کیڑے اور ناسور کی طرح بڑی تیزی کے ساتھ ہماری سماجی زندگی کی ہڈیوں کو کھلاتا جارہا ہے۔ جس کا ہمیں ذرہ برابر بھی احساس نہیں۔ رسمِ جہیز نے اپنے ساتھ سماجی تباہ کاری وبربادی کا جو نہ تھمنے والا طوفان برپا کیا ہے، اس نے برصغیر ہندو پاک کے معاشرہ کا جنازہ نکال کر رکھ دیا ہے۔ آج ہماری سوسائٹی جہیز کی وجہ سے جن مصیبتوں میں گرفتار ہوتی جارہی ہے، وہ مختلف النوع ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے ہی ضرر رساں پہلوؤں پر محیط ہیں۔ جن کو ہم ان مختلف قسموں میں بانٹ سکتے ہیں:

(۱) خانہ تباہی:

اگر لڑکی اپنی حیثیت سے زیادہ جہیز لاتی ہے تو اس کے والدین اس قدر مقروض ہوجاتے

ہیں کہ اس سے سبکدوشی کے لیے دن رات ایک کر کے اپنا چین وسکون برباد کر لیتے ہیں۔ اگر جہیز لڑکے والوں کے حسب منشا نہیں ہے تو لڑکی کو بے جا تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور طعن وتشنیع کی بوچھاڑ کر کے اس کا جینا دوبھر کر دیتے ہیں اگر لڑکی والے طاقتور ہیں تو پھر مقدمہ بازی کا ایک لامحدود سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس میں بسا اوقات کتنے ہی گھر تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔

(۲) مہر کی زیادتی:

جہیز کی لعنتوں کی مار جھیل رہا سماج اب کثرت مہر کی پریشانیوں سے دوچار ہوتا جا رہا ہے؛ اس لیے کہ جب لڑکے والے جہیز کی خاطر اپنی حمیت وغیرت کا سودا کرنے پر بضد ہو جاتے ہیں تو پھر نکاح کے وقت لڑکی والے کی جانب سے مہر کی ایک خطیر رقم کی فرمائش ہوتی ہے؛ چونکہ لڑکے والے اپنی بے شرمی و بے حیائی کی وجہ سے مواقع گنوا چکے ہوتے ہیں، لہٰذا لڑکے کو مجبوراً قبول کرنی پڑتی ہے جو کہ لڑکے کی حیثیت سے زیادہ اور اس کی طاقت کے باہر ہوتی ہے۔ اور شریعت کے خلاف ہے۔ حضرت عمر بن خطابؓ فرماتے ہیں کہ خبردار عورتوں کے مہر میں زیادتی نہ کیا کرو؛ کیونکہ اگر یہ دنیا میں عزت اور اللہ کے نزدیک پرہیزگاری ہوتی تو اس کے سب سے زیادہ مستحق نبی اکرم ﷺ ہوتے مجھے نہیں معلوم کہ رسول اللہ ﷺ نے بارہ اوقیہ سے زیادہ پر اپنی کسی بیوی سے نکاح کیا یا اپنی کسی بیٹی کا نکاح کرایا ہو۔ اگر کوئی عورت دھوکہ سے بھی مہر کا مطالبہ کر بیٹھتی ہے تو پھر اس کی خیریت نہیں ہے، شوہر کی ناراضگی اور غصہ کا سامنا تو اس کو کرنا ہی پڑتا ہے اوپر سے ساس، سسر، نند اور دیگر اہلِ خانہ کی جلی بھنی بھی اس کو سننی پڑتی ہے؛ کیونکہ اس وقت اس کا مطالبہ شوہر اور اس کے اہل خانہ کی ناک اور انا کا مسئلہ چھیڑ دیتا ہے۔ لہٰذا کوئی عورت بھول سے بھی اس غلطی کو دہرانا نہیں چاہتی؛ حالانکہ مہر عورت کا شوہر پر جبری حق ہے، جس کا ادا کرنا شوہر پر واجب ہے، اگر ادا کیے بغیر شوہر مر جاتا ہے تو قیامت کے دن اس مرد سے اس کے بارے میں باز پرس ہوگی۔ بعض حالات میں زوجین کے مابین مزاج کی عدم موافقت یا بیوی کی بدچلنی اور بداخلاقی کے باوجود شوہر کثرت مہر کی وجہ سے اپنی بیوی کو طلاق نہیں دے سکتا، پھر شوہر ایک مقید پنچھی کی طرح پھڑ پھڑا کر صبر وتحمل کا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ اگر کوئی باغیرت انسان اس طرح کی بدچلن عورت سے نجات حاصل کرنے کے لیے عزم مصمم کر لیتا ہے تو مہر کی اس خطیر رقم کو ادا کرنے میں اپنی ہر کوشش صرف کر دیتا ہے، پھر نوبت مفلسی اور محتاجگی تک آپہنچتی ہے۔ جس کا حاصل خانہ بربادی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

(۳) کثرت طلاق:

رسم جہیز نے جو ہمارے سماج میں تباہی و بربادی کے دروازے کھولے ہیں، ان میں سے ایک کثرت طلاق ہے۔ آج کثرتِ جہیز کی لالچ میں طلاق دے کر اصول اسلام کا کھلا مذاق اڑایا جارہا ہے۔ اسلام نے ناگزیر حالت میں مرد کو طلاق کا اختیار دیا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنے ناجائز مطالبات کو منوانے کے لیے اس کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جائے۔ حدیث میں ہے ﴿قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہ ﷺ مَا أَحَلَّ اللّٰہُ شَیْئاً أَبْغَضَ مِنْ طَلَاقٍ﴾ (سنن ابوداود) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو حلال کیا ہے، ان میں اللہ کے نزدیک طلاق سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے۔

(۴) جہیز کے ڈر سے شکم مادر میں لڑکیوں کی نسل کشی:

جس جاہلانہ رسم وظلم کو اسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے ختم کردیا تھا، آج اس ترقی یافتہ دور میں جس تیزی کے ساتھ شکم مادر میں لڑکیوں کی نسل کشی کی جارہی ہے، وہ انسانیت کا بڑا ہی شرمناک پہلو ہے۔ ارشادِ باری ہے: ﴿إِذَا الْمَوْؤدَۃُ سُئِلَتْ بِأَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ﴾ (سورۂ تکویر: ۸؛۹) اس زندہ درگور لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تو کس گناہ کی پاداش میں قتل کی گئی تھی؟

(۵) جنسی بے راہ روی:

اس ترقی پذیر سماج میں جنسی بے راہ روی میں جہاں مغربی تہذیب کا اہم رول ہے، وہیں رسم جہیز کا بھی بہت بڑا دخل ہے۔ جن کے دو بہت بڑے اسباب ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ شکمِ مادر میں لڑکیوں کی مسلسل قتل کی وجہ سے لڑکیوں کی تعداد میں حیرت انگیز کمی آتی جارہی ہے، اور اس کے مقابلہ میں لڑکوں کی تعداد میں دوگنا اضافہ ہورہا ہے۔

ایک رپورٹ کے مطابق پنجاب و ہریانہ میں ۲۰۰۰ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی تعداد صرف ۱۲۰۰ ہے، کرناٹک میں ۱۰۰۰ لڑکوں کے مقابلے ۹۶۵ لڑکیاں ہیں اور جھارکھنڈ میں ۱۵۰۰ لڑکوں کے مقابلے میں ۱۲۲ لڑکیاں ہیں، ایسے حالات میں جوانی کی حد کو پار کرنے والے کنوارے نوجوان اپنے جنسی جذبات سے مغلوب ہوکر راستہ چلتے، چوک چوراہے یا جہاں موقع ملے سماج کی عفت مآب بیٹیوں کی عصمت تارتار کرتے ہیں۔ دوسرے بعض غریب لوگ اپنی لڑکیوں کی شادی کے لیے جہیز اکٹھا کرنے میں اس قدر محو ہوجاتے ہیں کہ اسی درمیان لڑکی حدِ بلوغ کا آنگن چھلانگ چکی ہوتی ہے پھر جب اس کی جنسی خواہشات سر ابھارتی ہے تو بعض لڑکیاں پاکیزگی لٹا کر

اپنے دامنِ عفت کو داغدار کر لیتی ہیں، ان میں سے بعض خودکشی بھی کر لیتی ہیں۔

(۶) لڑکیوں کی کالا بازاری:

اس جہیز کے بھیڑیئے سے چھٹکارا پانے کے لیے بہت سے والدین اپنی لختِ جگر کو بیچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور انسانی بھیڑیئے انھیں جیتے جی کوٹھوں کی سولی پر بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ اس طرح کے واقعات سے آج کل کے اخبارات بھرے پڑے ہیں۔

(۷) موت کی سوداگری:

آج جہیز کے نام پر ملت کی بے گناہ بیٹیوں کو جس طرح ہراساں کیا جا رہا ہے، وہ انسانیت کا بڑا ہی شرمناک پہلو ہے، روزانہ صبح صبح آپ جب اخبار کی ورق گردانی کرتے ہیں تو جلی حرفوں میں دل دہلانے والی سرخیاں زینتِ نگاہ بنتی ہیں کہ فلاں جگہ کم جہیز لانے کے جرم میں بدن پر تیل ڈال کر آگ لگا دیا گیا تو فلاں مقام پر گلا گھونٹ کر قتل کر دیا گیا اور فلاں جگہ جہیزی بھیڑیوں کی ایذا رسانی سے تنگ آ کر عورت نے خود ہی موت کو گلے لگا لیا۔ دخترانِ ملت کی نسل کشی کا یہ سلسلہ زور پکڑتا جا رہا ہے، نہ ملک کا قانون ان بے گناہوں کا مداوا بن رہا ہے اور نہ ہی حقوقِ نسواں کے علم بردار ادارے تحفظ فراہم کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں جہیزی چیتا کی بھینٹ چڑھنے والے صنفِ نازک کی جو تعداد ہمارے سامنے ہے، کسی ہوشمند اور حساس انسان کو تڑپا دینے کے لیے کافی ہے۔ ایک سروے کے مطابق ہمارے ہندوستان میں روزانہ ۱۹ عورتیں جہیز کی بلی چڑھ جاتی ہیں۔ ۲۰۰۵ء کی رپورٹ کے مطابق ہر ۷۷ منٹ پر ایک عورت جہیز کی سولی پر دم توڑتی نظر آتی ہے۔ کم جہیز لانے کی پاداش میں جو عورتیں موت کے گھاٹ اتار دی گئیں، ان کی ممکنہ اعداد شمار ذیل میں درج ہے: ۲۰۰۳ء میں ۶۲۰۸ عورتیں، ۲۰۰۴ء میں ۷۰۲۶ عورتیں اور ۲۰۰۵ء میں ۶۷۸۷ عورتیں ان میں سے اکثر قتل کے واقعات اتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش، آندھرا پردیش، راجستھان، کرناٹک، اڑیسہ، ہریانہ اور تمل ناڈو میں واقع ہوئے، جہاں جہیزی اموات کی شرح بہت زیادہ ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۲۰۱۰ء سے لے کر آج تک ہر سال تقریباً ۹۰۰۰ نو ہزار سے زیادہ خواتین کو جہیز کے معاملے کے باعث قتل کر دیا گیا۔

(۸) عورتوں کی حق وراثت سے محرومی:

جہیز کے پیسے کو حلال بنانے کے لیے یہ بہانہ بنایا جاتا ہے کہ جو ہم جہیز میں لے رہے ہیں لڑکی اپنے والدین کے مال میں اتنے کا حق رکھتی ہے۔ یہ بالکل واہیات فلسفہ ہے۔ ترکہ تو مرنے

کے بعد تقسیم ہوتا ہے، زندگی میں نہیں۔

ہندو لڑکی کے لیے وراثت کا حق تسلیم نہیں کرتے، اس لیے انہوں نے ڈوری اور تلک کی رسم ایجاد کرلی، مگر دینِ محمدی میں لڑکی بھی وراثت کا حق رکھتی ہے۔ پھر ہندوؤں کے طرز کو اپنانا اور خود کو مسلمان کہنا کہاں تک درست ہے؟

مسلمانوں میں جو لوگ با اثر، دین دار اور قومی جذبہ رکھنے والے ہیں انھیں حتمی طور پر اس جہیز کی لعنت کے خلاف صف آرا ہونا پڑے گا اور خصوصاً نوجوانوں کو اس راہ میں قربانی دینی پڑے گی اور جہیز خوروں کو مانگ سے روکنا پڑے گا؛ تاکہ بہت ساری دوشیزائیں بن بیاہی اپنے والدین کے کمزور کاندھوں پر بوجھ بن کر بیٹھی نہ رہ جائیں، آیئے ہم سب اس لعنت سے توبہ کریں اور اپنے گھر کو نمونہ عمل بنائیں!

و ما علینا إلاّ البلاغ

❁ ❁ ❁

فرقۂ اباضیہ
اپنے عقائد وافکار کے آئینے میں

از: مولانا اشرف عباس قاسمی
استاذ دارالعلوم دیوبند

پس منظر:

امسال رمضان شریف کا بیشتر حصہ تنزانیا (مشرقی افریقہ) کے دارالسلطنت دارالسلام میں گزرانے کا موقع ملا، دارالسلام میں مختلف شیعی گروہوں کے علاوہ فرقۂ اباضیہ بھی اپنی ایک خاص شناخت اور طاقت رکھتا ہے، اس فرقے کی پرشکوہ مسجدیں کسی بھی زائر کو دعوت نظارہ دیتی ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ایشیائی مسلمان، اباضیہ کو بھی اہل السنۃ والجماعۃ میں شمار کرتے ہوئے بلاجھجک ان کی مسجدوں میں نماز پڑھتے ہیں، اس صورتِ حال سے بے چین ہوکر میرے بعض فکرمند میزبانوں نے مجھ سے فرقۂ اباضیہ کی اصلیت اور معتقدات کے واضح کرنے کا مطالبہ کیا، میں نے ان سے وعدہ کرلیا تھا، یہ تحریر ان کے وعدہ کی تکمیل ہے۔

فرقۂ اباضیہ — تعارف وانتساب:

اسلام کی بنیادوں کو متزلزل کرنے اور مسلمانوں کو ابتدا ہی سے غیرمعمولی نقصانات پہنچانے میں روافض کے ساتھ خوارج کا اہم کردار رہا ہے، یہ صحیح ہے کہ مرورِ زمانہ کے ساتھ خوارج کی ساکھ کمزور ہوتی گئی اور وہ رفتہ رفتہ ناپید ہوتے گئے؛ تاہم بعض علاقے اب تک خارجی اثرات ومعتقدات کے زیر اثر ہیں اور انھی خوارج کی باقیات میں سے فرقۂ اباضیہ بھی ہے۔

مذہب اباضیہ کو عام طور سے عبداللہ بن اباض تمیمی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، جن کی

وفات ۸۰ ھ میں ہوئی ہے؛ جبکہ علمی اور فکری اعتبار سے اس کا سرچشمہ ابوالشعثاء کو قرار دیا جاتا ہے۔ ابوالشعثاء جابر بن زید متوفی ۹۳ ھ محدث، فقیہہ اور ابن عباسؓ کے شاگرد ہیں، دیگر مذاہب کی طرح اباضیہ کے پاس بھی مسائل کے استنباط کے خاص مناہج اور فقہی اصول وضوابط ہیں۔ فرقۂ اباضیہ کو ''اہلِ دعوت، اہل استقامت اور جماعۃ المسلمین'' کے ناموں سے بھی جانا جاتا رہا ہے۔ (دیکھیے مقدمة الفقه الإسلامي وأدلته ۱/۵۶)

اباضی علماء اور مستند کتابیں:

مشہور اباضی علماء میں جنھیں مرجعیت حاصل رہی ہے۔ ابراہیم اَطّفش الجزائری اور ابراہیم بن عمر بیوض الجزائری ہیں۔ یہ دونوں اباضیت میں متشدد نہیں تھے، حتیٰ کہ آخرالذکر کے بارے میں بعض لوگوں نے دعویٰ کیا ہے کہ مرنے سے پہلے انھوں نے اباضیت سے توبہ کرکے مالکی مسلک کو اختیار کرلیا تھا؛ اگرچہ اباضیین اس کی سختی سے تردید کرتے ہیں۔ اباضیین کے یہاں معتمد اور مستند کتابوں میں، عقیدہ میں نورالدین سالمی کی مشارق الانوار، اصول فقہ میں طلعۃ الشّمس، فقہ میں محمد اطفیش کی شرح النیل وشفاء العلیل۔ سعدی کی قاموس الشریعۃ اور احمد کندی کی المصنف جیسی کتابیں ہیں؛ جبکہ حدیث میں مسند الربیع بن حبیب کو اتنی زیادہ اہمیت دے رکھی ہے کہ وہ اسے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا مصداق اور صحیح بخاری وصحیح مسلم سے فائق قرار دیتے ہیں۔

عمان، اباضیہ کا مرکز:

اس وقت اباضیین کی بڑی تعداد الجزائر، تونس، لیبیا، مشرقی افریقہ اور سلطنت عمان وغیرہ میں آباد ہے۔ عمان کو ان کی مذہبی اور فکری سرگرمیوں کا مرکز قرار دیا جاسکتا ہے؛ کیوں کہ ایک اندازے کے مطابق وہاں کے پچھتّر فیصد باشندے اباضی ہیں۔ شیخ ابوزہرہ مصری فرماتے ہیں: یہ فرقہ خارجیوں میں معتدل اور فکر ورائے میں عام مسلمانوں سے زیادہ قریب، غلو اور انتہاپسندی سے الگ تھا، نیز وہ لکھتے ہیں: یہی وجہ ہے کہ عالمِ اسلام کے بعض اطراف میں یہ اب تک موجود ہیں۔'' (تاریخ المذاہب الاسلامیہ مترجم: ۱۰۷)

یاقوت حمویؒ نے بھی اپنے دور کے باشندگان عمان کی اکثریت کو اباضی قرار دیا ہے، وہ کہتے ہیں:

"أكثر أهلها في أيامنا خوارج إباضية، ليس بها من غير هذا المذهب إلا طارى غريب، وهم لا يخفون ذلك" (معجم البلدان ٤/ ١٥٠)

ترجمہ: ہمارے زمانے میں عمان کے اکثر باشندے اباضی خوارج ہیں، اور سوائے کسی اجنبی نووارد شخص کے اباضیہ کے علاوہ کو ماننے والا کوئی شخص نہیں ہے، اور اباضیین اپنے عقائد کو چھپاتے بھی نہیں ہیں۔

عقائد میں اباضیہ کا اہل السنۃ والجماعۃ سے اختلاف

چند اہم عقائد جن میں اباضیہ کا نقطۂ نظر اہل السنۃ والجماعۃ سے مختلف ہے، درج ذیل ہیں:

۱- اباضیین صفاتِ الٰہی کا انکار کرتے ہیں، اور صفات کو عین ذات باری تعالیٰ قرار دیتے ہیں؛ جبکہ اہل السنۃ والجماعۃ، ذات باری تعالیٰ کے لیے صفات کو ثابت جانتے ہیں۔

۲- آیات ربانیہ اور صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ آخرت میں اہل ایمان کو اللہ پاک کا دیدار نصیب ہوگا؛ چنانچہ سورۂ یونس کی آیت کریمہ "للذين أحسنوا الحسنى وزيادة" (یونس:٦) ''جن لوگوں نے نیکی کی ہے ان کے واسطے خوبی ہے اور مزید برآں بھی'' میں زیادہ کی تفسیر خود نبی کریم ﷺ نے دیدارِ الٰہی سے کی ہے؛ چنانچہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت پاک "للذين أحسنوا ... کی تلاوت کرنے کے بعد فرمایا: جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں چلے جائیں گے تو ایک پکارنے والا پکارے گا، اے جنتیو! اللہ پاک نے تم سے ایک وعدہ کر رکھا ہے، اللہ اپنے اس وعدے کو پورا کرنا چاہتا ہے، تو جنتی جواب دیں گے، وہ کیا ہے؟ کیا اللہ پاک ہمارے ترازو کو بھاری، ہمارے چہروں کو روشن اور ہمیں دوزخ سے دور کر کے جنت میں داخل نہیں کر دیا ہے؟ رسول اکرم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: اس کے بعد پردہ ہٹا دیا جائے گا اور جنتی اللہ پاک کا دیدار کریں گے، تو خدا کی قسم اللہ کی عطا کردہ ساری نعمتوں میں اللہ کا دیدار سب سے پسندیدہ اور آنکھوں کو ٹھنڈک بخشنے والا ہوگا''۔ یہ حدیث مسلم شریف، ترمذی شریف سمیت کئی کتب حدیث میں موجود ہے، اور اس مضمون کی اور بھی متعدد روایات ہیں، لہٰذا قرآنی آیات اور احادیث وآثار کے پیش نظر اہل السنۃ کا اجماعی عقیدہ ہے کہ آخرت میں اللہ پاک کا دیدار ہوگا؛ لیکن اباضیین اس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ ممکن ہی نہیں ہے۔

۳- اباضیین، قرآن کریم کے مخلوق اور حادث ہونے کے قائل ہیں، جو معتزلہ کا مشہور عقیدہ ہے۔ اسی کے انکار کی وجہ سے معتزلہ کی ایماء پر عباسی خلفاء نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ پر کوڑے برسائے اور سخت اذیتیں دیں؛ لیکن حضرت امام کے پائے استقامت میں ذرا جنبش نہیں ہوئی اور وہ اہل السنۃ والجماعۃ کے اس عقیدے پر جمے رہے کہ قرآنِ مقدس مخلوق نہیں، جو حادث ہو، یہ اللہ پاک کا کلام ہے جو اس کی صفات میں سے ہے۔

۴- اباضیین کا عقیدہ ہے کہ جو شخص گناہ کبیرہ کا ارتکاب کر کے دنیا سے جائے گا؛ اگرچہ وہ کلمہ گو اور پابند نماز وغیرہ ہو، پھر بھی اسے ہمیشہ کے لیے جہنم میں جانا پڑے گا۔ اسے کبھی جنت نصیب نہیں ہوگی؛ جبکہ اہل السنۃ والجماعۃ کا متفقہ عقیدہ ہے کہ مرتکب کبیرہ ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا۔ اگر ایمان پر اس کا خاتمہ ہوا ہے تو اسے بھی اللہ پاک جنت کا داخلہ نصیب کریں گے، یا تو اللہ پاک اس کا گناہ معاف کردیں یا گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد اللہ پاک اس کے حق میں جنت کا فیصلہ فرمادیں؛ چنانچہ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''اہل توحید میں سے کچھ لوگوں کو جہنم میں عذاب دیا جائے گا، یہاں تک کہ وہ اس میں کوئلہ بن جائیں گے، پھر اللہ کی رحمت متوجہ ہوگی، تو انھیں آگ سے نکال کر جنت کے دروازوں پر ڈال دیا جائے گا، تو جنتی ان پر پانی چھڑکیں گے جس کے نتیجے میں وہ اس طرح اگیں گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ میں گھاس اگ جاتی ہے''۔

۵- جنھوں نے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا ہے، اباضیین کے نزدیک وہ مستحق شفاعت نہیں ہیں، جبکہ اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ ہے کہ ان کے حق میں بھی شفاعت ہوگی۔ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ليخرجن قوم من امتي من النار بشفاعتي يُسمّون الجهنميين''

ترجمہ: میری سفارش کی وجہ سے میری امت کے ایک گروہ کو جن کا لقب جہنمی پڑ جائے گا، جہنم سے نکالا جائے گا۔

۶- قرآن وحدیث میں آخرت کے متعلق کئی چیزوں کا تذکرہ ہے، مثلاً میزانِ عدل قائم کیا جائے گا، پل صراط سے گزرنا ہوگا؛ لیکن اباضیین اس طرح کی چیزوں میں تاویل کرتے ہیں اور احادیث میں ان چیزوں کی جو تفصیلات ہیں انھیں نہیں مانتے ہیں؛ جبکہ اہل السنۃ والجماعۃ اسی طرح ان کو مانتے ہیں جس طرح رسول اکرم ﷺ نے خبر دی ہے۔

۷- اہل السنۃ والجماعۃ کا اتفاق ہے کہ قرآنِ مقدس کے بعد روئے زمین پر سب سے صحیح کتاب بخاری شریف ہے، اس کے بعد مسلم شریف وغیرہ دیگر کتب احادیث کا مقام ہے؛ لیکن اباضیین اس تصور کو خارج کردیتے ہیں، ان کے نزدیک بخاری ومسلم سے بڑھ کر مسند ربیع بن صہیب ہے۔ قرآن مجید کے بعد سب سے اہم کتاب وہ اسی مسند کو قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح اباضیین نے بہت سے اجماعی مسائل کا بھی انکار کیا ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: موسوعة الأديان والمذاهب المعاصرة ۶۲/۱)

چند متفقہ فقہی مسائل میں اباضیہ کا شذوذ:

جب اصول وعقائد میں اباضیہ کا نقطۂ نظر اہل السنۃ والجماعۃ کے نقطۂ نظر سے مختلف ہے، تو فروع وجزئیات فقہیہ میں اختلاف تو لابدی اور فطری ہے۔ ہم یہاں چند اہم مسائل درج کررہے ہیں، جن میں اباضیین نے اہل السنۃ والجماعۃ کے اجتماعی موقف سے شذوذ کیا ہے۔

۱- شیعوں کی طرح اباضیین بھی اس بات کے قائل ہیں کہ خفین پر مسح کرنا جائز نہیں؛ حالاں کہ چمڑے کے موزے پر مسح کا جواز اہل السنۃ کا متفقہ مسئلہ ہے اور امام ابوحنیفہؒ نے خفین پر مسح کے جواز کو اہل السنۃ والجماعۃ کی علامتوں میں شمار کیا ہے۔

۲- نماز کے آغاز میں تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھانے کے قائل نہیں، اور پوری نماز ہاتھ چھوڑ کر ہی ادا کرتے ہیں۔

۳- اگر رمضان میں حالت جنابت میں صبح ہوئی تو اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا۔

۴- جو جزیہ نہیں دیتے، مثلاً موجودہ اہل کتاب، ان کا ذبیحہ حرام ہے۔

۵- ورثہ کے علاوہ دیگر رشتہ داروں کے لیے وصیت واجب ہے۔

۶- مکاتب، عقد کتابت کے وقت سے ہی آزاد ہے۔

اباضیین کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم:

اباضیین کے پیچھے نماز پڑھنے کا بھی وہی حکم ہوگا، جو حکم خوارج کے پیچھے نماز پڑھنے کا ہے۔ یعنی اگرچہ اہل السنۃ والجماعۃ انھیں کافر نہیں قرار دیتے؛ لیکن ان کے عقائدِ فاسدہ اور اعمالِ شنیعہ کی وجہ سے ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے ضرور منع کرتے ہیں، عرب علماء، چوں کہ اباضیین کے احوال

سے زیادہ واقف ہیں؛ اس لیے ہم اس سلسلے میں زیادہ تر انھیں کے فتاویٰ نقل کرتے ہیں۔

مشہور عرب عالم ابن جبرین فرماتے ہیں: "ثم هم مع ذٰلك يكفرون أهل السنة ويمنعون خلفنا، فلذٰلك يقول: لا يصلى خلف هٰذه الطائفة"

ترجمہ: اباضیین اپنے غلط افکار کے ساتھ اہل السنۃ کو کافر قرار دیتے ہیں اور ہمارے پیچھے نماز پڑھنے سے روکتے ہیں؛ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ اس فرقے کے پیچھے نماز نہیں پڑھی جائے گی۔

شیخ محمد بن ابراہیم نے تو اباضیہ کے پیچھے نہ صرف نماز پڑھنے کو ناجائز قرار دیا ہے؛ بلکہ واضح طور پر کہا ہے کہ فرقۂ اباضیہ سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کی گواہی بھی شرعاً معتبر نہیں ہوگی۔ (دیکھیے: فتاویٰ الشیخ محمد بن ابراہیم ۳۰/۱۳)

سعودی عرب کے مفتیان کرام کی جماعت نے بھی یہی فتویٰ دیا ہے کہ اباضیین کے پیچھے نماز درست نہیں ہوتی؛ کیوں کہ اباضیہ فرق ضالہ میں سے ہے۔ (دیکھیے: فتویٰ اللجنۃ الدائمۃ رقم: ۶۹۳۵)

ان کے علاوہ شیخ سلمان العودۃ اور شیخ سلمان الغصن بھی اباضیہ کے پیچھے نماز درست نہیں قرار دیتے۔

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانویؒ نے بھی ایک سوال کے جواب میں تحریر کیا ہے: ''عبداللہ بن اباض کی جانب منسوب جو فرقۂ اباضیہ ہے اور جو خوارج ہی کی شاخ ہے، ان کے عقائد کتابوں میں ملتے ہیں، اگر یہ فرقہ بعینہٖ وہی ہے یا ان کے عقائد ان کے مطابق ہیں تو ان کے پیچھے نماز نہیں ہوتی؛ اس لیے ان کے پیچھے نماز نہ پڑھی جائے''۔ (احسن الفتاویٰ: ۱/۱۹۸)

مفتی شعیب اللہ خاں مفتاحی مدظلہ فرماتے ہیں:

''عمان کے اباضیہ دراصل خوارج ہیں؛ لہٰذا ان کے پیچھے نماز درست نہ ہوگی، اگرچہ یہ بہ نسبت دیگر فرق خوارج کے معتدل ہیں، تاہم جو بنیادی عقائد خوارج کے ہیں، ان میں یہ بھی شامل ہیں۔'' (نفائس الفقہ ۴۲۰/۴)

اہل السنۃ والجماعۃ کے تئیں اباضیہ کا سخت موقف:

یہاں اس امر کا بھی اظہار مناسب ہے کہ خوارج کی طرح، اباضیین بھی اپنے علاوہ اہل السنۃ والجماعۃ اور عامۃ المسلمین کے حوالے سے انتہا پسندانہ نظریات رکھتے ہیں۔ ان کی رائے میں ان کے علاوہ تمام مسلمان کافر ہیں۔ اور جنت میں وہی داخل ہوگا جو اباضی عقیدے پر مرا ہو۔

اباضیین کے علاوہ جتنے مسلمان ہیں سب کو ہمیشہ کے لیے جہنم میں جانا پڑے گا۔

چنانچہ مشہور اباضی عالم ابوبکر بن عبداللہ الکندی نے لکھا ہے:

"ونحن نَشْهَدُ لمن مات من هؤلاء مصرا على خلاف ما دانت بها الإباضية بالخزي والصغار والخلود في النار" (الجوهر المقتصر ص ۱۲۱)

ترجمہ: اور ان مسلمانوں میں سے جو اباضیہ کے عقیدے سے ہٹ کر کسی اور عقیدے پر مرے ہم اس کے لیے رسوائی، ذلت اور ہمیشہ کے لیے جہنم کی شہادت دیتے ہیں۔

ایک اور اباضی عالم مہنا بن خلفان نے اباضیہ کے معتقدات وافکار ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے: "وإن مات على خلافه فليس له في الآخرة إلا النار وبئس المصير" (لباب الآثار ۲۷۸/۱)

ترجمہ: اور اگر کوئی اس کے علاوہ کسی اور عقیدے پر مرے تو آخرت میں اس کے لیے صرف جہنم ہے اور جہنم بہت برا ٹھکانہ ہے۔

درج بالا تصریحات سے واضح ہے کہ فرقۂ اباضیہ اپنے معتقدات کی وجہ سے اہل السنۃ والجماعۃ سے خارج ہے اور یہ ایک گمراہ فرقہ ہے جو دیگر مسلمانوں کو جہنمی خیال کرتا ہے؛ اس لیے اس فرقے کے زہریلے اثرات سے اپنے معاشرے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے بالکلیہ احتراز کرنا چاہیے۔ اللہ پاک ہم سب کو صراط مستقیم پر گامزن رکھیں! (آمین)

❁ ❁ ❁

بے پردگی کے نقصانات

از: مولانا شفیق احمد قاسمی، ریاض

اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں نعمت اسلام سے نوازا اور ایک ایسی شریعت دی جس میں صحیح عقائد، عمدہ اخلاق اور کردار کی پاکیزگی کی اعلیٰ تعلیم ہے اور شرک وبدعت و بداخلاقی اور بے حیائی سے ممانعت پوری تاکید کے ساتھ موجود ہے۔ اور ہر ہر قدم پر علم وعمل اور قانون کے ذریعہ عفت و پاک دامنی کو فروغ دیا گیا اور بے حیائی، زنا کاری وغیرہ پر پابندی عائد کی گئی ہے۔

پاکیزہ معاشرہ اور صاف ستھری سوسائٹی کے لیے عورتوں کو گھروں میں رکھ کر گھریلو ذمہ داریاں ان کو دی گئیں اور مردوں کو باہر کی ذمہ داریوں کا پابند کر کے مردوں اور عورتوں کو باہمی اختلاط سے روکا گیا؛ تاکہ ایک صاف ستھرا اور پاکیزہ معاشرہ وجود میں آسکے اور مسلم معاشرے کی یہ خصوصیت اب تک باقی تھی اور تقریباً پچاس سال سے غیروں کی حیاسوزی کی تحریک؛ بلکہ یلغار سے ہمارا معاشرہ بری طرح متاثر ہوا ہے اور افسوس اور حد درجہ ماتم کی چیز یہ ہے کہ اس کا مقابلہ اور فحاشی کا خاتمہ کرنے اور اس پر روک لگانے کے بجائے بعض مسلم دانشوران اس کوشش میں ہیں کہ بے حجابی کو جواز کا درجہ دے دیا جائے؛ بلکہ بعض نے تو چہرہ کے حجاب کو غیر ضروری قرار دے دیا ہے اور اس بات کا دعوی ہی نہیں؛ بلکہ دعوت دینی شروع کر دی ہے کہ چہرہ، ہتھیلیوں اور پیروں کو کھلا رکھا جائے۔

اسی پس منظر قرآن وحدیث کی روشنی میں چہرہ کے حجاب پر چند دلائل پیش خدمت ہیں:

(۱) قرآن مجید نے مردوں اور عورتوں کو مشترکہ حکم: یَحْفَظُوا فُرُوْجَهُمْ اور یَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُن (سورۂ النور ۳۰۔۳۱) کے الفاظ میں دیا ہے، اور بار بار قرآن کے بہت سے مقامات اور احادیث میں بہ کثرت یہ حکم وارد ہوا ہے، یہ سب کو معلوم ہے کہ شرم گاہ کی حفاظت چہرہ کے پردہ سے ہی ہوتی ہے۔ اور عصمت دری کی ابتداء چہرہ کی بے پردگی سے ہو کر زنا کی حد تک جا پہنچتی

ہے۔چنانچہ مشہور حدیث میں اس کی طرف اشارہ ہے:

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: اَلْعَیْنَانِ تَزْنِیَانِ وَزِنَاھُمَا النَّظْرُ اور مزید فرمایا کہ وَالْفَرْجُ یُصَدِّقُ ذٰلِكَ اَوْ یُکَذِّبُہٗ (صحیح بخاری) آنکھ بھی زنا کرتی ہیں اور ان کا زنا بدنگاہی ہے اور شرم گاہ اس کی تصدیق یا تکذیب کردیتی ہے۔

(۲) وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِھِنَّ عَلٰی جُیُوْبِھِنَّ (سورۂ النور ۳۱) اور عورتوں کو چاہیے کہ اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہیں، یعنی دوپٹہ سروں سے چہرہ اور گلے کو ڈھانکتے ہوئے سینہ کو بھی اچھی طرح چھپائیں اور اگر صرف یہ مراد لیا جائے کہ سینوں پر ہی ڈالے رہیں تو بھی ضمناً چہرہ کا پردہ بدرجۂ اولیٰ ثابت ہوگا؛ کیونکہ چہرہ ہی اصل جمال اور فتنہ کا سامان ہے، حسن وقبح کا معیار چہرہ ہی ہے، لہٰذا چہرہ کا حجاب بدرجۂ اولیٰ ثابت ہوا۔

(۳) غَضِّ بَصَر والی آیت میں دو جگہ اِلَّا مَا ظَھَرَ کے الفاظ آئے ہیں۔حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر کے مطابق پہلے اِلَّا مَا ظَھَرَ سے زینت ظاہرہ کی طرف اشارہ ہے، خواہ وہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہوں جیسے چہرہ، ہتھیلی وغیرہ خواہ انسانوں کی بنائی ہوئی ہوں جیسے آرائشی اور جاذب نظر لباس یا برقع۔ اور دوسرے اِلَّا مَا ظَھَرَ سے باطنی زینت مراد ہے۔مطلب یہ ہے کہ اگر تمام تر کوشش کے باوجود اجنبی پر زینت ظاہرہ یعنی آرائشی لباس، چہرہ اور ہتھیلیاں کھل جائیں تو معاف ہیں اور زینت باطنہ کوشش کے باوجود افراد خانہ پر کھل جائیں تو معاف ہیں۔ اِلَّا مَا اَظْھَرْنَ کے بجائے اِلَّا مَا ظَھَرَ کے الفاظ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کا حکم دیا اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر کے مطابق آیت کا یہی مطلب ہے۔

(۴) وَلَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِھِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِھِنَّ (سورۂ النور ۳۱) عورتوں کو زمین پر پیر پٹخ کر چلنے کی ممانعت اس لیے ہے کہ کہیں پازیب کی جھنکار زینت سے واقف ہوکر کوئی گرویدہ نہ ہوجائے؛ حالانکہ نقاب میں رہ کر پیر پٹخنے والی کالی، گوری، جوان، بوڑھی، حسین اور بدصورت کوئی بھی عورت ہوسکتی ہے۔اگر پازیب کی آواز کو پردہ میں رکھا گیا ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ ایک حسین وجمیل جوان عورت کو سرخی، پاوڈر اور زیب وزینت کی تمام فتنہ سامانیوں کے ساتھ کھلے چہرہ گھومنے کی اجازت ہوجائے، نہیں ہرگز نہیں۔

(۵) وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِکَاحاً (سورۂ النور ۶۰) بوڑھی عورتوں جن کی عمر بالکل ختم ہو اور ان میں اب کسی کو ترغیب باقی نہ رہی ہو۔قرآن مجید میں صرف انہیں کو

فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ کے الفاظ سے چہرہ کھولنے کی اجازت ضروردی ہے؛ لیکن آگے وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ کے ترغیبی الفاظ لاکران کوبھی ترغیب دی کہ چہرہ کوڈھانکنا تمہارے لیے بہرحال افضل ہے، یہاں اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ سے پورے یا آدھے کپڑے اتارنا نہ تو مراد ہے نہ عرفاً ایسا ہوتا ہے اور نہ ہی کسی نے یہ معنی لیے ہیں، یہاں اجازت چہرہ کھولنے کی دی جارہی ہے، بوڑھیوں اور صرف بوڑھیوں کو چہرہ کھولنے کی اجازت کا واضح مطلب یہی ہے کہ ان سے کم عمروالیوں کو چہرہ کھولنے کی کسی صورت میں بھی اجازت نہیں ہے۔

(۶) آیت حجاب کی تفسیر میں قرآن کے بہترین ماہر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا فرمان ان الفاظ میں ہے کہ مسلمان عورت کو جب کسی مجبوری سے باہر نکلنا پڑے تو ان کو جلباب یعنی بڑی چادریں اپنے سروں پر اس طرح اوڑھ لینا چاہیے کہ رخسار، گردن، گلا اور سینہ پوری طرح چھپ جائے اور راستہ دیکھنے کے لیے صرف ایک آنکھ کھلی ہونی چاہیے۔ اَلضَّرُوْرَةُ تَتَقَدَّرُ بِقَدْرِهَا صحابی کی تفسیر حجت ہی نہیں؛ بلکہ بقول بعض علماء مرفوع حدیث کا درجہ رکھتی ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب آیت حجاب نازل ہوئی تو انصار عورتیں ایسی تواضع وانکساری سے سروں پر کالی چادریں ڈال کر نکلتی تھیں گویا ان کے سروں پر کوے بیٹھے ہوں جو ذراسی حرکت سے اڑجائیں گے۔

احادیث کی روشنی میں چہرہ کا حجاب:

(۱) قال النبی ﷺ اِذَا خَطَبَ اَحَدُكُمُ امْرَأَةً فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّنْظُرَ اِلَيْهَا (رواہ احمد) جب تم میں سے کوئی کسی عورت کو پیغام نکاح دینے کا ارادہ کرے تو اس کو دیکھ لینے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

اس حدیث میں صرف پیغام نکاح دینے والوں کو اجنبیہ کو دیکھنے میں گناہ سے مستثنیٰ کرنے کا مطلب واضح ہے کہ اوروں کو دیکھنے اور دکھانے میں گناہ ہوگا۔ واضح ہو کہ خطبہ (پیغام نکاح) میں صرف چہرہ ہی دیکھا جاسکتا ہے۔

(۲) بخاری ومسلم کی روایت ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ نے عورتوں کو عیدگاہ جانے کا حکم دیا تو بعض صحابیات نے عرض کیا کہ ہم میں سے بعض کے پاس جلباب نہیں ہے تو ارشاد نبوی ہوا: لِتُلْبِسْهَا اُخْتُهَا مِنْ جِلْبَابِهَا کہ اپنی بہنوں کو اپنے جلباب میں کرلیا کرو۔ اس سے بھی عیاں ہے کہ صحابیات بغیر حجاب کے نہیں نکلتی تھیں۔

(۳) قال النبی ﷺ مَنْ جَرَّ ثَوْبَهٗ خُیَلَاءَ لَمْ یَنْظُرِ اللّٰهُ اِلَیْهِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فَقَالَتْ امّ سَلمة رضی اللّٰه عنها کَیْفَ تضع النساء بِذُیُوبِهِنَّ قَال: یُرْخِیْنَهٗ شِبْرًا، قالتْ اِذَنْ تَنْکَشِف اَقْدَامُهُنَّ، قال ذِرَاعاً وَلَا یَزِدْنَ عَلَیْهِ.

پیروں کو چھپانے کے لیے جو کہ موقع زینت نہیں ہیں، اگر کپڑے دراز کرنے کا حکم ہے تو کیا چہرہ کو کھولنے کی اجازت ہو جائے گی۔

نسائی کے علاوہ صحاح ستہ میں مکاتب سے بھی پردہ کا حکم ہے جو کہ ابھی بھی پورے طور سے اجنبی نہیں ہوا ہے۔

نیز حالت احرام میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث کہ جب مردوں کا گزر ہوتا تھا تو ہم عورتیں اپنے چہروں کو ڈھانک لیتی تھیں؛ حالانکہ حالت احرام میں کشف وجہ یعنی چہرہ کا کھولنا واجب ہے؛ لیکن ایک عمومی واجب پر عمل کرنے کے لیے تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی احرام کے واجب کو ترک کر دیتی تھیں، ورنہ اگر چہرہ کا حجاب عام حالت میں مستحب ہوتا تو استحباب کے لیے صحابیات اور خاص طور سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ترک واجب نہ کرتیں۔ رواہ ابوداود) ان پاکیزہ تعلیمات پر ہمیں دل وجان سے عمل کرنا چاہیے تھا چہ جائے کہ ہم ہی بے حیائی اور بے پردگی کا جواز تلاش کرنے لگیں۔

سادگی اپنوں کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

اس کے برخلاف غیروں نے ہمیں آلودہ کرنے اور فحاشی کے دلدل میں کس طرح ڈبونے کی کوششیں کی ہیں، ذرا ایک نظر ادھر کر لینا مناسب ہوگا۔

اب اسکولوں میں مخلوط تعلیم اور ایسے یونیفارم کا رواج دیا جا رہا ہے کہ جس میں نصف برہنی کے ساتھ بے حیائی ہے۔ مخلوط تعلیم اور بے حیائی کے لباس پر اعتراض کرنے والوں کو قدامت پسند اور دقیانوس کہہ دیا جاتا ہے؛ حالانکہ اسکولوں کی بے حیائی والے ماحول میں نشو ونما پانے کے بعد کالج اور یونیورسٹی میں پہنچنے تک مسلم بچیوں کے رنگ وروپ بالکل بے حیائی میں ڈھل چکے ہوتے ہیں اور حیاسوزی اور فحاشی کے وہ مناظر سامنے آنے لگتے ہیں کہ انسانیت اور شرم وحیا اپنا سر پیٹ کے رہ جائیں۔

سوال یہ ہے کہ تعلیم کے لیے کیا مخلوط تعلیم ضروری ہے اور کیا بے حجابی اور نیم عریانی کے بغیر کوئی لیکچر سمجھ میں نہیں آئے گا اور کیا کسی مضمون کو سمجھنے کے لیے زیب وزینت والا چہرہ ضروری ہے

اور کیا چھوٹے اور چست لباس کے بغیر کوئی کتاب سمجھی نہیں جاسکتی۔ اور کیا کلچر کے نام پر والدین کے سامنے ان کی بیٹیوں کو اسٹیج پر بے حیائی کے لباس میں ڈانس کروانا اور نچوانا حصول تعلیم کے لیے ضروری ہے۔ یہ سب بے حیائی کے کام اب مسلمان بھی کر رہے ہیں۔ ان احوال میں ہزاروں نہیں؛ بلکہ لاکھوں لوگ ایڈز کی وجہ سے موت کے منہ میں ہیں تو کونسی تعجب کی بات ہے، نیز محبت میں ناکامی کی وجہ سے اگر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں خودکشی کرتے ہیں تو اس میں حیرت ہی کیا اور اگر اسقاط حمل کی وجہ سے لاکھوں جانیں ضائع جائیں تو یہ کونسی انہونی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قانون کا مذاق اور فطرت کے خلاف جنگ کا بالکل یہی نتیجہ ہونا چاہیے! اللہ ہم سب کو عقل سلیم عطا فرمائے! اور اپنے حکموں پر عمل کرنے کی توفیق بخشے! (آمین)

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبؔر وہیں پہ غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کے پردہ کا کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

❁ ❁ ❁

ویکسین! ایک غور طلب پہلو

تحریر وتخریج: ڈاکٹر مبشر حسین رحمانی
بہ تعمیلِ ارشاد: حضرت مولانا مفتی محمد نعیم میمن صاحب، خلیفہ حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ

بنی نوع انسان کو ازل سے ہی طرح طرح کی بیماریوں سے واسطہ پڑتا رہا ہے، ان میں سے کچھ بیماریاں ایسی ہیں جو موروثی (genetic) ہوتی ہیں اور کچھ وبائی (epedimic) صورت اختیار کر جاتی ہیں۔ میڈیکل سائنس کی ترقی کی وجہ سے انسان نے نہ صرف ان بیماریوں کی تشخیص کی ہے؛ بلکہ ان بیماریوں کے اسباب اور سدِباب کی تدابیر اختیار کیں۔ ان بیماریوں میں کچھ بیماریاں ایسی ہیں جو کہ وائرس (virus) اور بکٹیریا (bacteria) کے ذریعہ پھیلتی ہیں، جن کو انسانی آنکھ خردبین (microscope) کے بغیر نہیں دیکھ سکتی۔ اس قسم کی بیماریوں کے تدارک کے لیے ویکسین (viccine) کا استعمال کئی دہائیوں سے جاری ہے۔

ویکسین، مائیکروآرگنیزم (microorganism) کی مدد سے تیار کی جاتی ہے اور ایک صحت مند انسان کو قوتِ مدافعت بڑھانے کے لیے دی جاتی ہے، اس مائیکروآرگنیزم کے مقابلے میں جس کی مدد سے وہ ویکسین تیار کی گئی ہے۔ عمومی طور پر ۵ سال کی عمر تک آتے آتے ایک بچے کو تقریباً ۱۵ سے ۲۰/ اقسام کی ویکسین دی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ملک سے دوسرے ملک سفر کرنے سے پہلے بھی ویکسین دی جاتی ہے، جن کی تعداد ۱۰ سے ۱۲ کے قریب ہے۔ پاکستان میں بھی حکومتی سطح پر ویکسین پلانے کی مہم چلائی جاتی ہے حتیٰ کہ حج کے سفر سے پہلے کئی اقسام کی ویکسین حاجی کو پلانا لازمی قرار دیا گیا ہے۔

ویکسین کی تیاری کے لیے کئی اقسام کے خلیات استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ امر توجہ طلب ہے کہ یہ خلیات انڈا، دودھ، جیلیٹن (gelatine) کے علاوہ کئی اقسام کے جانوروں کے خلیات مثلاً گھوڑا، گائے، سور اور بندر سے بھی حاصل کیے جاتے ہیں۔ ہم قارئین کی سہولت کے لیے

آسٹریلوی ڈاکٹروں اور سائنس دانوں کی ایک ٹیم کے تحقیقاتی مقالے سے جو Medical Journal of Australia (4) میں چھپا ہے، ان خلیات کو ذکر کرتے ہیں، جن سے ویکسین تیار کی جاتی ہیں (دیکھیے ٹیبل نمبر ا) اس تحقیق سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کچھ ویکسین کی تیاری میں سور، بندر اور گھوڑوں کے خلیات کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ پاکستان میں چونکہ آج کل پولیو ویکسین کا خاص چرچہ ہے؛ لہٰذا ہم اس سے متعلق چند تفصیلات ذکر کرتے ہیں۔

ٹیبل نمبر ا: ویکسین اور ان کے اجزائے ترکیبی کی تفصیل (4)

بیماری	ویکسین	خلیات
Diphtheria/ Pertussis/ Poliomyelitis پولیو / tetanus	Infanrix IPV (GSK)	Monkey cell culture, biological culture بندر
Diphtheria/ hepatitis B/ pertussis/ poliomyelitis پولیو/ tetnus	Infanrix Penta (GSK)	Yeast)hep B), monkey cell culture, biological culture
Poliomyelitis پولیو	Ipol (Aventis Pasteur)	Monkey cell culture بندر
Diphtheria/ Haemophilus/ influenzae/ hepatitis B/ pertussis/ poliomyelitis پولیو / tetnaus	Infanrix Hexa (GSK)	Yeast (hep B), monkey cell culture, Biological culture بندر
Diphtheria/ tetanus	ADT (CSL); CDT (CSL)	گائے، سور یا گھوڑا
Diphtheria toxoid	Diphtheria Vacc (Adsorbed) (CSL); Diphtheria Vacc (Adsorbed) (Adult)	گائے، سور یا گھوڑا
Pneumococcal نمونیا	Pneumovax 23 (MSD)	خرگوش
Tetanus	Tet-Tox (CSL)	گائے، سور یا گھوڑا
Plague (Yersinia pestis) طاعون	Plague Vaccine (CSL)	گائے، سور یا گھوڑا

پولیو ویکسین (Polio or Poliomyelitis): پولیو ایک ایسا مرض ہے جو کہ وائرس کے ذریعے پھیلتا ہے۔ یہ وائرس انسان کے اعصابی نظام (nervous system) پر حملہ کرتا ہے جس کی وجہ سے گھٹنوں کے اندر انسانی جسم مفلوج ہوجاتا ہے۔ ابھی تک پولیو کا کوئی علاج دریافت نہیں ہوا۔ پولیو کو روکا جاسکتا ہے، اگر پولیو ویکسین کئی مرتبہ پلائی جائے۔ عالمی ادارہ صحت کی رپورٹ (Polio Fact Sheet No: 112, Oct 2012 www.who.int) کے مطابق زیادہ تر ۵ سال کے کم عمر بچوں پر پولیو اثر انداز ہوتا ہے۔ پولیو کیسز کے اندر ۱۹۸۸ سے ۲۰۱۱ تک ٪۹۹ کمی واقع ہوئی ہے۔ ۲۰۱۲ کے اندر صرف تین ممالک پاکستان، افغانستان، اور نائیجیریا، وہ ممالک ہیں جن کے اندر پولیو ابھی باقی ہے۔ پولیو پر سالانہ ایک بلین ڈالر خرچ کیے

جاتے ہیں؛ جب کہ ۲۰۱۳ سے ۲۰۱۸ تک ۵.۵ بلین ڈالر خرچ کرنے کا تخمینہ لگایا گیا ہے۔ حکومت پاکستان کے نیشنل ایمرجنسی ایکشن پلان 2012 NEAP کی دستاویز کے مطابق پاکستان میں ۲۰۱۱ میں ۱۵۴ پولیو کے کیسز سامنے آئے ہیں۔

بحیثیت مسلمان ہم لوگوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ حلال وحرام میں تمیز کریں، حلال کو اختیار کریں اور حرام کو چھوڑیں۔ پولیو ویکسین کی حلت وحرمت پر تو حضرات مفتیانِ کرام ہی فیصلہ صادر فرمائیں گے؛ مگر ہم ذیل میں صرف کچھ سائنسی تحقیقات کے حوالہ جات دے رہے ہیں جن سے یہ بات عیاں ہے کہ پولیو ویکسین بنانے کے لیے بندر کے گردے کے خلیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

- ویلفر ڈ بیکر اور ان کے ساتھی ڈاکٹروں نے ۲۰۱۱ء میں ویکسین جرنل میں تحقیقی مقالہ لکھا ہے جس میں کئی جگہ اس بات کا ذکر ہے کہ پولیو ویکسین کی تیاری کے لیے بندر کے گردے کے خلیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ (۱)
- جاپان کے KAKETSUKEN Institute اور Astellas Pharma Inc کے درمیان پولیو ویکسین بنانے کی تفصیل کے ذیل میں بندر کے گردے کے خلیے کے استعمال کا ذکر موجود ہے۔ یہ معاہدہ جولائی ۲۰۱۲ء میں ہوا۔ (۲)
- New zealand کے وزارتِ صحت کے ذیلی ادارے MEDSAFE نے Polio Sabin بنانے کی تفصیل ذکر کی ہے جس میں بندر کے گردے کے خلیے کے استعمال کا ذکر ہے۔ (۳)
- آسٹریلیا کے ڈاکٹروں اور سائنسدانوں کی ایک ٹیم نے ایک تحقیقی مقالہ میڈیکل جرنل آف آسٹریلیا MJA میں ۲۰۰۶ء میں لکھا ہے، جس کے اندر پولیو ویکسین کے اجزائے ترکیبی میں بندر کے خلیے کے استعمال کا ذکر موجود ہے۔ (۴)
- نیل ملر نے ایک تحقیقی مقالہ Medical Veritas میں لکھا ہے اور اس بات پر تفصیلی بحث کی ہے کہ جو پولیو ویکسین بنانے کے لیے بندر کے خلیے استعمال کیے گئے ہیں، اس سے کئی طرح کی بیماریاں پیدا ہوسکتی ہیں جن میں ایڈز اور Mad Cow Disease کا ذکر بھی موجود ہے۔ (۵)
- نیچر (Nature) جو تحقیقی مقالوں کو چھاپنے کا سب سے اعلیٰ جرنل ہے، میں ۲۰۰۴ء کے اندر

ایک تحقیقی مقالہ چھپا ہے جس میں ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے اس بات پر بحث کی ہے کہ جو ایڈز ہے وہ پولیو ویکسین سے نہیں پھیل رہا ہے اور اس تحقیقی مقالے میں یہ بات بھی ذکر کی گئی ہے کہ پولیو ویکسین بنانے کے لیے بندر کے گردے کے خلیے استعمال کیے جاتے ہیں۔(۶)

❁ Hooper E. نے ۱۹۹۹ میں کتاب لکھی ہے جو کہ لندن میں چھپی ہے، جس میں ایڈز کو پولیو کے قطروں کا شاخسانہ قرار دیا گیا ہے۔(۷)

ان تمام تفصیلات کے بتانے کے بعد ہم دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت ہمیں حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین!

❁ ❁ ❁

حوالہ جات

(1) Wilfried A. M. Bakker, Yvonne E. Thomassen, Aart G. van't Oever, Janny Westdijk, Monique G.C.T. van Oijen, Lars C. Sundermann, Peter wan't Veld, Eelco Sleeman, Fred W. van Nimwegen, Ahd Hamidi, Gideon F.A. Kersten, Nico van den Heuvel, Jan T. Hendriks, Leo A. van der pol, Inactivated polio Vaccine development for technology transfer using attenuated sabin poliovirus strains to shift from Salk-IPV to Sabin- IPV, Elsevier Vaccine Journal, vol 20, pages 7188-7196, 2011

(2) Agreement between KAKETSUKEN (The Chemo-Sero-Therapeutic Research Institute) and Astellas Pharma Inc., July 27, 2012.

(3) MedSafe: http://www.medsafe.govt.nz/profs/datasheet/p/poliosabinoralsus.htm

(4) Barbara E Eldred, Angela J Dean, Treasre M McGuire and Allan L Nash, Vaccine components and constituents: responding to consumer concerns, MJA, Volume 184, Number 4, 20 February 2006.

(5) Neil Z. Miller, The polio vaccine: a critical assessment of its a cane history, efficacy, and long-term health-related consequences, Medical Veritas 1 (2004) 239-251.

(6) Michael Worobey et al., Contaminated polio vaccine theory refuted, NATURE, Vol 428, 22 April 2004, www.nature.com/nature

(7) Hooper, E. The River: A Journey Back to the Source of HIV and AIDS, (Penguin, London, 1999).

❁ ❁ ❁

دہلی اور اقوام متحدہ کا فروغ ''زنا'' قانون

از: ڈاکٹر ایم اجمل فاروقی
۱۵- گاندھی روڈ، دہرہ دون

الگ الگ خوش نما ناموں سے دو قانونی دستاویز دہلی اور اقوام متحدہ میں قانونی شکل میں زنا، بے حیائی، بے لگام آزادی کو تحفظ دینے کے لیے وجود میں آرہی ہیں؛ حالاں کہ دہلی والی دستاویز دہلی اجتماعی عصمت دری کے پس منظر میں زنا مخالف قانون کہلائی جارہی ہے؛ مگر اس کی خصوصی شق جس پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ زنا بالرضا (رضامندی سے غیر قانونی جنسی فعل) کی عمر میں لڑکی کی مرضی کی عمر ۱۸ سال سے کم کرکے ۱۶ سال کردی جائے گی، یعنی اب لڑکی جو ۱۶ سال کی ہوگئی ہو، اپنی مرضی سے کسی سے بھی جنسی تعلق استوار کرسکے گی (حکومت میں اس پر اختلاف ہے؛ مگر فیصلہ اسی کے حق میں ہونے کی امید ہے) اور کوئی بھی اسے روک نہیں سکے گا، ماں باپ بھی نہیں اور جس طرح یہ پہلے جرم سمجھا جاتا تھا، اب یہ جرم نہیں رہے گا۔ اس کے علاوہ دہلی کی دستاویز میں جس طرح تاک جھانک، گھورنا، چھونا وغیرہ کو قابل دست اندازی پولیس جرم بنایا گیا ہے، اور زنا کی تشریح اس طرح کی گئی ہے کہ اس میں متاثرہ Victim ہمیشہ خاتون ہوگی اور مرد ہمیشہ مجرم ہوگا۔ یعنی اس کو ناممکن مانا گیا ہے کہ عورت کبھی بھی مرد کو زنا کرنے پر مجبور کرسکتی۔ قانون کا نام ''زنا مخالف بل'' Anti rape law ہے؛ مگر یہ سب سے زیادہ زور زنا کے محرکات کو فروغ دینے والی شق پر کیوں دے رہا ہے؟ اپنی مرضی سے شادی کرنے کی عمر ۱۸ سال اور زنا کرنے کی عمر ۱۶ سال، یہ ہے انسانی دماغ کی قانون سازی کے ناقص ہونے کا بہترین نمونہ۔ ہندوستان میں یہ ''فروغ زنا قانون'' بنایا جارہا ہے، اس کے لیے سارا فکری، ذہنی اور سازشی مواد دراصل اقوام متحدہ کی آڑ میں بین الاقوامی شیطانی، دجالی تہذیب کے سرداروں؛ بلکہ ائمۂ ضلالت وخباثت امریکہ، یوروپ اور اسرائیل سے منظّم طریقہ سے مہیا کرایا جارہا ہے۔ ایک طرف یہ ادارہ مذہبی شخصیات کی توہین کے خلاف قانون پاس نہیں کررہا ہے، جس

سے دنیا کے ہر مذہب کے ماننے والے دنیا کی بڑی آبادی کے لوگ سکون حاصل کرسکیں، اور یہی ادارہ اِن مسلم ممالک پر دباؤ ڈال رہا ہے جہاں توہین رسالتؐ کے خلاف قوانین بنائے گئے ہیں؛ مگر دنیا بھر میں جنگ وجدال، ہتھیاروں کی تجارت، بھکمری، بے روزگاری، ماحولیاتی آلودگی، لڑکیوں کی کم ہوتی تعداد، ڈرگس اور الکوحل، سگریٹ کے بڑھتے استعمال کو کنٹرول کرنے میں دلچسپی نہیں دکھا رہا ہے۔ ابھی اقوام متحدہ نے ''خواتین کے حقوق کے اعلامیہ'' کی آڑ میں جس طرح یوروپ اور امریکہ کی جنسی بے راہ روی، حرامی بچوں، بے شادی کے جوڑوں، ہم جنسی، طلاق کی بے پناہ کثرت، عزت اور عصمت فروشی، جسم فروشی کی غلیظ تہذیب کو اقوامِ عالم پر تھوپنے کی شیطانی کوشش کی ہے، وہ دنیا کے تمام انسان دوست طاقتوں کو اس کے خلاف صف آرا ہونے کے لیے آخری موقع ہوسکتا ہے۔ پہلے ذرا اس شیطانی دستاویز کے نکات پر سرسری نظر ڈال لیں۔ شوہر کی اجازت کے بغیر سفر کرنے، نوکری کرنے، مانع حمل دواؤ کا استعمال کرنے، جنسی تعلقات بنانے، اسقاطِ حمل کرانے، کم عمر لڑکیوں کے لیے مانع حمل ادویات کا استعمال کرنے، بچوں کی پرورش میں زن وشوہر میں ذمہ داریاں تقسیم ہوجانے کی آزادی ہوگی۔ بچوں کی پیدائش پر بھی خاتون کا کنٹرول ہوگا، خاتون اپنے شوہر کے خلاف زنا یا جنسی دست درازی کا مقدمہ درج کراسکے گی۔ اس دستاویز کے ذریعہ ہم جنس پرستوں، عورتوں کا کاروبار کرنے والوں، ولدالزنا (ناجائز اولادوں)، شوہروں کے ساتھ دوسروں سے بھی جنسی تعلقات بنانے والیوں کے برابر کے حقوق دیے جانے کا حکم دیا گیا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس دستاویز کے خلاف امت مسلمہ کی تنظیم O.I.C. یا خادم الحرمین شریفین کی حکومت یا عرب حکومتوں کا مجموعی طور پر کوئی مزاحمتی رویّہ سامنے نہیں آیا۔ بھارت بھی اپنی سنسکرتی کی لاج بچانے کے بجائے ''ترقی پسند'' حقوق نسواں کا چمپین کہلانے کے شوق میں چپ رہا۔ صرف روس، ویٹکن، مصر، لبنان، ایران، فلسطین، اردن، تیونسیا نے مخالفت میں آواز اٹھائی، سب سے زیادہ خوشی کا اظہار دجّالی تہذیب کے سردار کی جانب سے ہی کیا گیا ہے۔

دہلی اور اقوام متحدہ کی دستاویز پوری دنیائے انسانیت کو اس بربادی، خاندانی انتشار، جنسی بے راہ روی، طلاق کی کثرت، ناجائز اولادوں کی کھیپ بڑھانے، معاشرہ میں بھروسہ اعتماد اور محبت وتعاون کے جذبہ کی فضاء کو ختم کرنے کی طرف لے جارہی ہے، جس سے آج امریکہ یوروپ اور ان کے دل دادہ غلام حکمراں لے جانا چاہتے ہیں۔ یہ سب مل کر دنیا میں عدل، امن،

انصاف، سماجی، اقتصادی، معاشی برابری اور انصاف کی حکمرانی کے بجائے دنیا میں نفس پرستی، امیر طبقہ کی عیاشیوں اور سرمایہ داروں کی تجوریوں کو بھرنے کا ماحول بنانا چاہتے ہیں۔

اقوام متحدہ اور دہلی کے لال بجھکڑوں سے صرف ایک سوال ہے کہ کیا پورے امریکہ اور یوروپ میں پچھلے کم سے کم ایک سو سالوں سے ہی قوانین جاری و ساری نہیں ہیں؟ تو کیا وہاں عورتوں کی حالت، خاندانی نظام، امراض خبیثہ کی شرح، طلاق کی شرح، ناجائز اولادوں کی شرحِ پیدائش، شادی کے باہر تعلقات کے نتیجہ میں ہونے والا تشدد اور مایوسی وانتشار کی سطح تمام دنیا کے لیے لائق تقلید ہے؟ کیا مغرب کی عورت آج خود مطمئن ہے؟ کیا یہ خواہش پرستی ہمیں جانوروں کی سطح پر نہیں لارہی ہے، شاید اُس سے بھی کمتر سطح پر؛ کیونکہ شاید جانوروں میں ہم جنس پرستی نہیں پائی جاتی، ہاں ہوسکتا ہے کہ وہ اقوام متحدہ اور دہلی کی دستاویزوں کے عملی نمونوں سے شہ پاکر انسانوں کی طرح ترقی یافتہ ہوجائیں۔ گمراہی اور انسانی تباہی کی طرف نسل انسانی کو دعوت دینے والے یہ سارے ادارہ اور افراد کیا اتنے جاہل اور اندھے ہیں کہ انھیں نظر نہیں آتا کہ دونوں کی ظاہری اور اندرونی بناوٹ، ساخت، افعال، ہارمون، حیض، حمل، نفاس کا مختلف نظام کسی طرح چیخ چیخ کر اپنے لیے الگ الگ طرح کے حقوق اور دائرہ کار کا تقاضہ کررہے ہیں؟ کیا ماضی میں کبھی بھی اس فطرت سے بغاوت کرنے والی کوئی بھی تہذیب باقی رہ سکی؟ کیا برائی یا بے انصافی کا علاج زیادہ بڑی برائی اور بے انصافی سے ممکن ہے؟ اگر اقوام متحدہ اور مغرب تقسیم دائرہ کار کو نہیں مانتا تو ان کو ریکارڈ دکھانا ہوگا کہ پچھلے سو سالوں میں کتنی خواتین C.E.O ہوئیں، FBI. CIA یا کسی بھی یوروپی ملک کی کمانڈر انچیف مقرر ہوئیں؟ سوائے عریانیت کے دنیا کو اس آزادی نے کیا دیا؟ کم سے کم امت مسلمہ کے پاس اَمر بالمعروف ونہی عن المنکر ایسے حال میں فرض ولازم ہے۔

❁ ❁ ❁

ایک ''محدث گر'' کی رحلت

از: مولانا محمد صاحب پرتاب گڑھی
استاذ فیض العلوم، نیرل

حضرت مولانا زین العابدین صاحب ایک محدث ہی نہیں؛ بلکہ محدث گر تھے، وہ نہ صرف ناقد، اصولی اور فن اسماء الرجال کے ماہر تھے۔ ان کی سادگی، بے نفسی، تواضع، فروتنی اور عاجزی کو دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ دریائے علم کے اتنے بڑے شناور اور فضل وکمال کے اتنے بڑے پیکر ہیں۔ میانہ قد، سر پر عمامہ، ہاتھ میں عصا، منھ میں پان اور لب پر سرخی کے خفیف اثرات، سرخی مائل چہرہ، نحیف وناتواں جسم کے اس مشت استخواں کو دیکھ کر شائبہ بھی نہ گزرتا کہ علوم ومعارف کے ایسے ایسے دریا ان کے سینے میں موج زن ہوں گے۔ سنا ہے کہ زمانہ طالب علمی میں مولانا کے ذوق مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ جمعہ کے دن جب ہفتہ واری تعطیل رہتی؛ تو آپ نے ناظم کتب خانہ سے معاہدہ کر رکھا تھا کہ وہ آپ کو صبح سویرے کتب خانہ کے اندر داخل کر کے باہر سے دروازہ بند کر دیتے اور نماز جمعہ تک آپ محو مطالعہ رہتے۔ اسی طرح آپ چھٹی کے دنوں میں بھی کتابوں کا کیڑہ بنے رہتے تھے۔ اس دور انحطاط وتنزل میں وہ سلف صالحین اور قدیم علماء و محدثین کی جیتی جاگتی تصویر تھے، وہ اپنے علم وفضل، تقوی وطہارت، صبر وشکر، سادگی وانکساری اور خشیت وانابت میں قرون اولی کی یادگار تھے۔ علم حدیث اور فن اسماء الرجال تو خیر حضرت مولانا کا خصوصی فن تھا، دیگر علوم میں بھی ان کو اتنی مہارت تامہ حاصل تھی کہ انتہائی مشکل سے مشکل گتھی اور پیچیدہ سے پیچیدہ علمی مباحث کو چٹکیوں میں حل فرما دیتے تھے، میرے بڑے بھائی مولانا صغیر صاحب حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی ''رد قادیانیت'' کی بابت معرکۃ الآراء تصنیف ''عقیدۃ الاسلام فی حیات عیسی علیہ السلام'' کی ترجمانی کا کام حضرت مولانا انظر شاہ صاحب علیہ الرحمہ کے حسب حکم کر رہے تھے، اس وقت مشکل مباحث اور پیچیدہ گتھیوں کا حل

حضرت مولانا زین العابدین اعظمی کے پاس ہی ملتا تھا۔حضرت مولانا کتاب کو صرف ایک نظر دیکھتے اور فوراً پوری بحث کا خلاصہ بتا دیتے تھے،جب کہ بعض مرتبہ اسی عبارت کے حل کے لیے اس سے پہلے کی جانے والی بڑی سے بڑی کوشش بے سود ثابت ہو چکی ہوتی۔اساتذۂ دارالعلوم دیوبند میں سے ایک قدیم اور مشہور و معروف استاذ نے بھائی صاحب سے پوچھا تھا کہ مولانا صغیر! اس کتاب کو تم حل کیسے کرتے ہو؟ میں نے تو اسے سات مرتبہ پڑھا؛ مگر میری سمجھ میں نہیں آئی۔اس کتاب کا حوالہ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر عثمانی برترجمہ شیخ الہند میں آیت ''اِذْقَالَ اللّٰہُ یَا عِیْسٰی إِنِّی مُتَوَفِّیْكَ '' کی تفسیر کرتے ہوئے دیا ہے اور آخر میں لکھا ہے: اہل علم حضرات سے میری یہ گزارش ہے کہ اس کتاب کو پڑھنے کی ہمت فرمائیں۔

حضرت مولانا زین العابدین صاحب اعظمیؒ کی پوری زندگی جہدِ مسلسل اور عملِ پیہم سے عبارت تھی،وہ اپنے شاگردوں اور خدام کے جھرمٹ میں بھی اپنا ذاتی کام خود سے انجام دے لینے میں کبھی کسی قسم کا تکلف محسوس نہ کرتے،زندگی میں انہیں جن پُر پیچ راہوں اور دشوار گزار گھاٹیوں سے واسطہ پڑا تھا،ان کی وجہ سے وہ منجھ کر کندن بن گئے تھے،مشکل سے مشکل احوال میں دینی خدمات کی انجام دہی اور علوم اسلامیہ کی حفاظت کے لیے ہمہ وقت کمربستہ رہنا ان کا خصوصی امتیاز تھا،انھوں نے اس راہ میں بڑی اولوالعزمی اور خندہ پیشانی کے ساتھ تمام مصیبتوں اور پریشانیوں کا سامنا کیا تھا۔وہ سنت نبوی کے حقیقی شیدائی اور علم دین کے سچے عاشق تھے۔ایسا نہ تھا کہ دینی وعلمی تعلیم وتدریس میں ان کی مشغولیت کسی مجبوری کا نتیجہ تھی، بلکہ ان کے گھر پر نہایت عمدہ ''بنارسی ساڑیاں'' بنانے کا کارخانہ تھا،وہ اس میں لگ کر ایک مال دار اور اعلی صنعت کار بن سکتے تھے؛ مگر انھوں نے ان بکھیڑوں سے یکسو ہو کر ''لیلائے علم'' کے گیسو سنوارنے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر رکھا تھا،وہ ضرورت کا ہر کام از خود اپنے ہاتھ سے کرنے کے عادی تھے۔یاد پڑتا ہے کہ بڑے بھائی مولانا صغیر صاحب جس زمانہ میں مظاہر علوم کے شعبہ تخصص فی الحدیث میں تعلیم حاصل کر رہے تھے،ان کے ساتھ حضرت مولانا سید ارشد مدنی دامت برکاتہم العالیہ کے فرزند ارجمند مولانا سید ازہر مدنی بھی تھے،یہ حضرات کھانا اور ناشتہ وغیرہ ساتھ ہی کیا کرتے تھے، بندہ راقم انہی ایام میں گنگوہ پڑھنے کے لیے گیا تھا؛ مگر طبیعت نہ لگنے کی وجہ سے گنگوہ سے واپس آکر بھائی جان کے پاس ''شعبہ تخصص'' کے احاطہ ہی میں ڈیرہ ڈالے ہوا تھا،ہولی کا دن تھا،اس

دن مدرسہ کا دروازہ دن بھر بند رہتا، باہر رہنے والے اساتذہ اس دن دوپہر کو باہر نہیں نکلتے؛ تاکہ کسی ناخوش گوار واقعہ سے بچا جاسکے، بھائی صاحب نے بتایا کہ آج حضرت الاستاذ مولانا اعظمی اور مولانا عبداللہ صاحب معروفی ساتھ ہی میں کھانا تناول فرمائیں گے۔ مولانا عبداللہ صاحب حضرت کے بھتیجے اور ان کے خصوصی تربیت یافتہ شاگرد ہیں، پہلے وہ مظاہر علوم کے شعبہ تخصص میں استاذ تھے، بعد میں جب یہ شعبہ دارالعلوم دیوبند میں قائم ہوا؛ تو انتظامیہ دارالعلوم نے ان کو حضرت مولانا نعمت اللہ اعظمی کے تعاون کے لیے دارالعلوم دیوبند طلب کرلیا۔ کھانا کھاتے وقت دیکھا کہ حضرت کے گھر سے جو کھانے کا ڈبہ آیا ہے، اس میں کا گوشت کچھ کچّا رہ گیا تھا، حضرت فرمانے لگے کہ بھائی ہولی کی وجہ سے جلدی جلدی میں فجر سے پہلے ہی کھانا پکایا گیا تھا، اس وجہ سے گوشت ذرا کم پکا ہے۔ حیرت وتعجب تو اس وقت ہوا؛ جب معلوم ہوا کہ وہ پورا کھانا خود حضرت مولانا نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ اللہ اکبر! یہ محدث کبیر اور عمر کے اس نہائی حصہ میں! اور حال یہ کہ اپنا ذاتی کام اس خاموشی اور چابکدستی سے انجام دے لیتے ہیں کہ شاگردوں کو خبر بھی نہیں ہونے پاتی! اس کو کہتے ہیں استغناء اور زہد عن الدنیا، اس کو کہتے ہیں ورع اور تقوی!۔

علاوہ استاذی وشاگردی کے رشتہ کے؛ کچھ اس وجہ سے بھی بھائی صاحب، حضرت مولانا اعظمی کے الطاف وعنایات کے خاص مورد تھے کہ حضرت مولانا اور ہمارے والد ماجد مولانا محمد یار صاحب پرتاپ گڑھی دونوں کا زمانۂ طالب علمی ایک ہی تھا، اور دونوں ہی میکدۂ مدنی (حضرت مولانا حسین احمد مدنی) کے قدح خواروں میں تھے؛ اس وجہ سے حضرت مولانا دیوبند تشریف لاتے؛ تو بھائی کے مکان پر قیام فرماتے اور اپنی عنایتوں وشفقتوں سے ہم لوگوں کو گراں بار فرماتے۔ خداوند قدوس نے مولانا زین العابدین صاحب کو تصنیف وتالیف کا بھی عمدہ ذوق عطا فرمایا تھا، بڑے بڑے علماء اپنے علمی مضامین اور تحقیقی کتابوں کی اصلاح آپ سے کرایا کرتے تھے۔ حضرت مولانا کا اچھا خاصا وقت ان ہی امور میں صرف ہوجایا کرتا تھا۔ نامور اور معتبر علماء کی غیر مستند باتوں پر آپ استدراک بھی فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے اپنے استاذ حضرت مولانا عبد الجبار صاحب معروفی کی عظیم علمی شاہکار ''امداد الباری شرح بخاری'' جو تشنۂ تکمیل رہ گئی تھی؛ اس کا تکملہ لکھا۔ محدث جلیل حضرت علامہ طاہر پٹنی کی اسماء الرجال سے متعلق مشہور ومعروف تصنیف ''کتاب المغنی'' کو اپنے حاشیہ اور تحقیق وتعلیق سے مرصع ومزین کیا۔ فارسی زبان میں ''علمائے

ہندوسندھ‘‘ کے تذکروں پر مشتمل ’’رحمان علی صاحب‘‘ کی کتاب ’’تذکرہ علماء ہند‘‘ کا اردو ترجمہ کیا۔حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ کی کتاب ’’المرتضیٰ‘‘ پر علمی نقد لکھا۔تبلیغی جماعت کے امور ستہ کو کتاب وسنت کے حوالوں سے مبرہن کیا۔علامہ ذہبی کے رسالہ ’’من یعتمد قولہ فی الجرح والتعدیل‘‘ میں مذکور اصولیین محدثین کے تراجم کو ایک مستقل تصنیف میں یکجا کیا۔امام ترمذی نے اپنی سنن میں جن روایات پر حسن، صحیح، حسن صحیح، حسن غریب، حسن صحیح غریب، غیر محفوظ، مضطرب وغیرہ کا حکم لگایا ہے؛ ان کو شمار کر کے ان پر اجمالاً وتفصیلاً احکام لگائے۔شرح عقائد نسفی کی عربی زبان میں شرح لکھی اور اردو زبان میں بھی اس کا ایک مختصر اور جامع نوٹ تیار کیا۔اسماء حسنیٰ اور القراءۃ المسنونہ نام کی کتابیں الگ سے تصنیف کیں۔وہ صاحب نسبت بزرگ اور شیخ طریقت بھی تھے، اس سلسلے میں ان کو اجازت وخلافت اپنے استاذ وشیخ حضرت مولانا عبدالجبار صاحب اعظمی شیخ الحدیث مدرسہ شاہی مرادآباد سے تھی، رمضان المبارک کی چھٹیوں میں جب مولانا زین العابدین صاحب اپنے وطن میں ہوتے؛ تو طالبین ومسترشدین کی ایک بڑی جماعت آپ کے ہمراہ اعتکاف میں ہوا کرتی اور اپنے دلوں کو مزکی ومصفی کرتی۔

مولانا زین العابدین صاحب اطراف اعظم گڑھ کی مشہور ومعروف علمی بستی قصبہ ’’پورہ معروف‘‘ ضلع ’’مئو‘‘ کے رہنے والے تھے۔ان کی ولادت اکتوبر ۱۹۳۲ء میں ہوئی تھی۔انھوں نے ابتدائی تعلیم پورہ معروف ہی میں حاصل کی۔وہاں آپ کے اہم اساتذہ میں حضرت مولانا عبدالستار صاحب معروفی سابق شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء تھے؛ جب کہ عربی تعلیم کے لیے آپ نے مدرسہ ’’احیاء العلوم مبارک پور‘‘ اعظم گڑھ میں داخلہ لیا؛ جہاں حضرت مولانا عبدالجبار صاحب سابق شیخ الحدیث مدرسہ شاہی مرادآباد وغیرہ کے پاس تحصیل علم کیا۔پھر مزید علمی تشنگی نے آپ کو ’’دارالعلوم دیوبند‘‘ پہونچا دیا؛ جہاں آپ نے چار سال تک قیام کر کے علوم نقلیہ قرآن وحدیث وفقہ اور علوم عقلیہ منطق، فلسفہ وغیرہ میں مہارت حاصل کی۔۱۳۷۲ھ میں اپنے تمام ساتھیوں پر سبقت حاصل کرتے ہوئے آپ نے دورۂ حدیث شریف میں اول درجے سے کامیابی حاصل کی۔دارالعلوم دیوبند میں آپ کے اہم اساتذہ میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا اعزاز علی امروہوی، علامہ محمد ابراہیم بلیاوی رحمہم اللہ وغیرہم ہیں۔فراغت کے بعد اپنے استاذ حضرت مولانا اعزاز علی امروہوی رحمہ اللہ کے مشورہ سے میرٹھ کے آس پاس تدریسی

خدمات انجام دیں، پھر آسام کے مدرسے میں تعلیم وتعلم سے وابستہ رہے۔اس کے بعد اپنے مادرعلمی احیاء العلوم مبارکپور اعظم گڑھ میں آئے اور بارہ سال تک تدریسی خدمات انجام دیں، پھر مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں بھی ۸؍سال تک مدرس رہے، پانچ سال تک ''چھاپی'' گجرات کے مدرسہ میں بھی تعلیمی خدمات انجام دیں، پھر مدرسہ مظہرالعلوم بنارس میں ۱۵؍سال تک شیخ الحدیث کے عہدے پر فائز رہے۔دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد میں بھی دوسال تک تدریسی خدمات انجام دیں۔اس کے بعد مظاہرعلوم سہارنپور میں شعبہ تخصص فی الحدیث کے بانی وسربراہ کی حیثیت سے آپ نے ۱۸؍سال گزارکر گزشتہ ۲۸؍اپریل ۲۰۱۳ء کو جان جاں آفریں کے حوالہ کردی۔اس طرح علم حدیث نبوی کا یہ نیر تاباں پون صدی تک علم حدیث کی عظیم ترین خدمات انجام دینے اور آسمان علم کو اپنی ضوفشانیوں اور درخشانیوں سے منور کرنے کے بعد قصبہ پورہ معروف ضلع مئو کے شہر خموشاں میں ہمیشہ ہمیش کے لیے روپوش ہوگیا۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!

❁ ❁ ❁